ماہنامہ شعاع عمل لکھنؤ

محرم نمبر ۱ سنہ ۱۴۲۵ھ



موسسۂ نور ہدایت حسینیۂ غفران مآبؒ لکھنؤ-۳

Monthly

SHUA-E-AMAL

Lucknow



NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION
Imambara Ghufran Maab
LUCKNOW-3 (U.P.) INDIA
Phone : 2252230

فہرست مضامین

محرم نمبر ۱۴۲۵ھ

اداریہ

ہندوستان میں بہت عرصے سے ایک علمی و تحقیقی مجلہ کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی اور تشنگان علم و عرفان مضطرب سے نظر آرہے تھے اور شاید انکی پریشانی اور اضطراب حق بجانب ہے کیونکہ مدارس دینیہ سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد کا معیار علمی اتنا گرتا جارہا ہے کہ ایک مدرسہ، حوزہ یا جامعہ کا ترجمان نہیں کہا جاسکتا اور خصوصاً جب ایک ادب دوست، علم و ہنر کا دلدادہ، جو ہر آن، ہر لمحہ صرف اسی فکر میں غلطاں ہے کہ کوئی تو ہو جو ایک ایسے چشمۂ آب زلال کی خبر دے، جس سے ہماری تشنگی برطرف ہوسکے۔

تو اسکی جستجو اسی نتیجہ پر منتہی ہوتی ہے کہ چلو ان مجلوں کا مطالعہ کرو جو مدارس علمیہ کی ترجمانی کرتے ہیں مگر جب وہ عصر حاضر کے شائع ہونے والے رسالوں کو اپنے لئے درمقصود سمجھتا ہے تو اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایسے ہی کچھ مسائل اور عصر حاضر کے جوانوں کے مذہبی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے مؤسسۂ نور ہدایت نے علمی و فکری ماہنامہ ''شعاع عمل'' شائع کرنے کا فیصلہ کیا جس میں ہمارے موجودہ علماء کرام و دانشمندان عظام کے قلمی شاہکار کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ علمائے ماسبق کے فراموش شدہ علمی کارناموں کو بھی منظر عام پر لایا جائے تا کہ ان کے رشحات قلم سے ہم اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ انکے کلام کی شستگی، اسلوب نگارش، اور اذہان ملت تک حق کا پیغام پہونچانے کے سلیقوں کو اپنا مطمع نظر قرار دیتے ہوئے، اپنے بھائیوں کو ایک مؤثر پیغام پہونچا سکیں۔

الحمدللہ ہمارے مجلہ میں موجودہ حالات کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے اور ہمیشہ یہی کوشش کی جائے گی کہ ایسے مضامین شائع کئے جائیں جن سے قوم وملت کی فلاح و بہبود وابستہ رہے۔ کیونکہ ہمارا ہدف یہ نہیں ہے کہ ہم قوم کو علمی طور پر مرعوب کریں بلکہ اس مجلہ کی اشاعت کے اہم اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ ہم اپنی اصلاح کریں، حقیقی مسلمان بننے کی کوشش کریں، ترقی یافتہ دور سے گناہوں کی آلودگی دور کریں اور نور ایمان وعمل سے ہر کوچہ، ہر جادہ کو منور کریں اور اپنے معاشرہ کو حقیقی ترقی یافتہ معاشرہ بنائیں یہی وجہ ہے کہ اس مجلہ کا نام ''شعاع عمل'' قرار پایا۔

مزید یہ کہ اس مجلہ میں قرآن کریم کے مختلف موضوعات سے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لئے الگ سے ایک

باب قائم کیا گیا ہے، جو قرآن شناسی کے عنوان سے ہے۔

خدائے رحیم و کریم سے مزید توفیق کے خواہاں ہیں اور ساتھ ہی ان حضرات کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری ہے جنھوں نے دامے، درمے، سخنے اس مجلہ کی اشاعت میں حصہ لیا۔ ادارہ کے سبھی کارکن اپنے معاونین کے لئے دست بدعا ہیں کہ خدا آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے آپ کے کاروبار میں بیش از پیش ترقی عنایت فرمائے۔

خدا کی توفیق کے ساتھ ساتھ اگر مومنین کی مالی امداد کا سلسلہ جاری رہا تو انشاء اللہ اس مجلہ میں چار چاند لگائے جاسکتے ہیں۔

آخر میں ارباب فکر ونظر سے التماس ہے کہ مستقل اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہیں تا کہ ادارہ مجلہ کی کمیوں کو دور کر سکے۔

مؤسّسۂ نور ہدایت
حسینیۂ حضرت غفران مآبؒ چوک لکھنؤ
(یو۔ پی) ہند

حسینؑ معراجِ انسانیت

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

جس طرح حضرت امام حسنؑ کی ولادت کے متعلق دو قول ہیں ۲ھ ۳ھ اسی اعتبار سے امام حسینؑ کی ولادت کے متعلق دو قول ہیں ۳ھ اور ۴ھ اگر ان کی ولادت ۲ھ میں ہوئی ہے تو ان کی ۳ھ میں ہے اور اگر ان کی ولادت ۳ھ میں ہے تو ان کی ۴ھ میں ولادت ہوئی ہے۔ اس طرح وفات رسولؐ کے وقت ان کا چھٹا یا ساتواں برس تھا۔

اس دور اور اس کے بعد جنابِ امیرؑ کے دور میں جو کچھ حسن مجتبیٰؑ کے ساتھ رہا وہ حسینؑ کی سیرت کے ساتھ بالکل متحد ہے اس لئے کہ ایک سال کے فرق سے کوئی فرق احساسات، تأثرات اور ان کے مقتضیات میں نہیں ہوتا۔ جن واقعات سے جتنا وہ متأثر ہو سکتے تھے اتنا ہی یہ اثر لے سکتے تھے۔ وفات رسولؐ کے بعد سے پچیس برس کا دور جو امیر المومنینؑ نے گوشہ نشینی میں گذارا وہ جس طرح ان کے لئے ایک دور ابتلاء تھا ان کے لئے بھی تھا۔ جو جو مناظر ان کے سامنے آرہے تھے وہ ان کے سامنے بھی بلکہ امام حسنؑ کو تو دنیا نے صرف بحیثیت صلح پسند اور حلیم کے پہچانا ہے اس لئے وہ اس دور میں ان کے امتحان کی عظمت کو بآسانی شاید محسوس نہ کرے مگر حسینؑ کو تو دنیا نے روز عاشور کی روشنی میں دیکھا ہے اور بڑا صاحبِ غیرت وحمیت، خوددار گرم مزاج اور اقدام پسند محسوس کیا ہے اس روشنی میں پچیس برس کے دور خاموشی پر نظر ڈالئے ظاہر ہے کہ ان کے شباب کی منزلیں وہی تھیں جو حضرت امام حسنؑ کی تھیں۔ ۲۵ سال کی مدت کے اختتام پر وہ تینتیس برس کے تھے تو یہ بتیس برس کے گویا عمر کے لحاظ سے حسینؑ اس وقت عباسؑ تھے کربلا میں جو ابوالفضل العباس کے شباب کی منزل تھی وہ ۲۵ سال کی گوشہ نشینی کے اختتام پر حسینؑ کے شباب کی منزل تھی۔ اس عمر تک وہ تمام واقعات سامنے آتے ہیں جو اس دور میں پیش آتے رہے اور امام حسینؑ خاموش رہے۔ مصائب وحوادث کے وہ تمام جھونکے آئے اور ان کے سکوت کے سمندر میں تموج پیدا نہ کر سکے۔

ان کے ۲۵ برس حضرت علیؑ کی مکہ کی زندگی کے ۱۳ برس کے موازی ہیں وہ پیغمبرؐ کی خاموشی کے رفیق۔ یہ حضرت علیؑ کی خاموشی کے ہمدم۔ وہ حضرت رسولؐ پر مظالم دیکھ رہے تھے جو ان کے مجازی حیثیت سے باپ کی حیثیت رکھتے تھے اور یہ حضرت علیؑ پر مظالم دیکھ رہے تھے جو ان کے حقیقی حیثیت سے باپ تھے جس طرح وہاں کوئی تاریخ نہیں بتاتی کہ کسی ایک دفعہ بھی علیؑ کو جوش آ گیا ہو اور رسولؐ کو علیؑ کے روکنے کی ضرورت پڑی ہو۔ اسی طرح کوئی روایت نہیں بتاتی کہ اس ۲۵ برس کی طویل مدت میں کبھی

حسینؑ کو جوش آ گیا ہو اور حضرت علیؑ نے بیٹے کو روکنے کی ضرورت محسوس فرمائی ہو یا سمجھانے کی کہ یہ نہ کرو۔ اس سے ہمارے مقصد یا اصول کو نقصان پہنچے گا۔

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ جب حضرت علیؑ نے میدان جہاد میں قدم رکھا تو اب جہاں حسنؑ تھے وہیں حسینؑ بھی تھے وہ باپ کے داہنی طرف تو یہ بائیں طرف۔ ہر معرکہ میں عملی حیثیت سے شریک ہیں۔ اس کے بعد جب صلحنامہ لکھا گیا تو جہاں بڑے بھائی کے دستخط ہیں وہیں چھوٹے بھائی کے دستخط۔ جناب امیرؑ کی شہادت کے بعد اسی طرح یہ حضرت امام حسنؑ کے ساتھ ہیں جہاد میں بھی اور صلح میں بھی۔ ابوحنیفہ دینوری نے الاخبار الطوال میں لکھا ہے کہ صلح کے بعد دو شخص امام حسنؑ کے پاس آئے۔ یہ جذباتی قسم کے دوست تھے صحیح معرفت نہ رکھتے تھے انھوں نے سلام کیا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا مُذِلَّ الْمُؤْمِنِیْنَ: "اے مومنوں کو ذلیل کرنے والے آپ پر سلام ہو"

یہ بخیال خود مومنین ہیں جن کا یہ اخلاق ہے اور یہ ان کا بلند اخلاق ہے کہ ایسے الفاظ کے ساتھ جو سلام ہو اس کا بھی جواب دینا لازم سمجھتے ہیں اور نرمی کے ساتھ فرماتے ہیں۔

لَسْتُ مُذِلَّھُمْ بَلْ مُعِزُّھُمْ میں نے مومنین کو ذلیل نہیں کیا بلکہ ان کی عزت رکھ لی اس کے بعد مختصر طور پر انہیں صلح کے مصالح سمجھائے جس پر وہ خاموش سے ہو گئے اور اب وہ اٹھ کر امام حسینؑ کے پاس آئے اور خود ہی یہ واقعہ پیش کیا کہ ہم سے امام حسنؑ سے گفتگو یہ ہوئی ہے۔ آپ نے امام حسنؑ کا جواب سننے کے بعد فرمایا:

صَدَقَ اَبُوْ مُحَمَّدٍ یعنی حضرت امام حسنؑ نے بالکل سچ فرمایا۔ صورت حال یہی تھی اور اس کا تقاضا اسی طرح تھا۔

بعض سور ماقسم کے آدمی آئے اور انھوں نے کہا: آپ حسن مجتبیٰؑ کو چھوڑ یئے، وہ صلح کے اصول پر برقرار ہیں مگر آپ اٹھئے ہم آپ کے ساتھ ہیں اچانک حکومت شام پر ہلّہ بول دیں۔ امام حسینؑ نے فرمایا: غلط بالکل غلط۔ ہم نے ایک معاہدہ کرلیا ہے اور اب ہم پر اس کا احترام لازم ہے۔ ہاں اسی وقت حضرت نے یہ کہہ دیا کہ تم میں سے ہر ایک کو اس وقت تک بالکل چپ چاپ بیٹھا رہنا چاہئے جب تک یہ شخص یعنی معاویہ زندہ ہے۔ یہ آپ کا تدبر تھا۔ آپ جانتے تھے کہ معاویہ کی طرف سے آخر میں اور شرائط کے ساتھ اس شرط کی خلاف ورزی ہوگی۔ کہ انہیں اپنے بعد کسی کو نامزد نہ کرنا چاہئے۔ اس وقت ہمیں اٹھنے کا موقع ہوگا۔

اب کون کہہ سکتا ہے کہ حسنؑ کی صلح کے بعد حسینؑ کی جنگ کسی پالیسی کی تبدیلی، ندامت و پشیمانی یا اختلاف رائے و مسلک کا نتیجہ تھی؟ ۲۰ سال پہلے کہا جا رہا ہے کہ ہمیں اس وقت تک خاموش رہنا چاہئے جب تک معاویہ زندہ ہے اس سے ظاہر ہے کہ ۲۰ برس کی طویل راہ کے تمام سنگ میل نظر کے سامنے ہیں اور پورا لائحہ عمل پہلے سے بنا ہوا مرتب ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ طویل سکوت بھی اسی معاہدہ کے ماتحت ضروری ہے اور اس وقت کے اقدام کا بھی اسی معاہدہ

کے ماتحت حق ہوگا۔ کیا اس کے بعد بھی اس میں کوئی شک ہے کہ حسن مجتبیٰؑ کی صلح حسینؑ بن علیؑ کی جنگ کی ایک تمہیدی تھی۔ اور کچھ نہیں۔

۴۱ھ میں یہ صلح ہوئی اور ۶۰ھ میں معاویہ نے انتقال کیا اس بیس سال کی طولانی مدت میں کیا کیا ناسازگار حالات پیش آئے اور عمال حکومت نے کیا کیا تکلیفیں پہنچائیں مگر ان تمام حالات کے باوجود جس طرح رسولؐ کے ساتھ علیؑ مکہ کی تیرہ برس کی زندگی میں جس طرح حضرت علیؑ کے ساتھ حسن مجتبیٰؑ اور خود حسینؑ ۲۵ برس کی گوشہ نشینی کے دور میں، اسی طرح حضرت امام حسنؑ کے ساتھ امام حسینؑ دس برس کے ان کے دور حیات میں جو صلح کے بعد تھا حالانکہ اس زمانہ کے حالات کو وہ کن عمیق قلبی تاثرات کے ساتھ دیکھتے تھے ان کا اندازہ خود ان کے اس فقرے سے ہوتا ہے جو انہوں نے حضرت امام حسنؑ کے جنازے پر مروان سے کہا تھا۔

جب مروان نے وفاتِ حسنؑ پر اظہار افسوس کیا تو امام حسینؑ نے فرمایا، کہ اب رنج وافسوس کررہے ہو اور زندگی میں ان کو غم وغصہ کے گھونٹ تم پلاتے تھے جو کہ یاد ہیں مروان نے جواب دیا بیشک! وہ ایسے کے ساتھ تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ متحمل اور پُرسکون تھا۔

یہ تعریف اس وقت مروان امام حسنؑ کی کررہا تھا جب دنیا سے اٹھ چکے تھے۔ مگر کیا اس تعریف میں خود حسینؑ بھی حصہ نہ رکھتے تھے؟ کیا اس طویل مدت میں انہوں نے کوئی جنبش کی جو حسن مجتبیٰؑ کے سکون کے مسلک کے خلاف ہوتی؟ پھر امام حسنؑ کے جنازے کے ساتھ جو ناگوار صورت پیش آئی وہ روضۂ رسولؐ پر دفن سے روکا جانا۔ وہ تیروں کا برسایا جانا۔ یہاں تک کچھ تیروں کا جسدِ امام حسنؑ تک پہونچنا۔ یہ صبر آزما حالات اور ان سب کو امام حسینؑ کا برداشت کرنا۔

کوئی شاید کہے کہ حسینؑ کیا کرتے؟ بے بس تھے مگر کیا کربلا میں حسینؑ کو دیکھنے کے بعد وہ یہ کہنے کا حق رکھتا ہے؟ کربلا میں تو سامنے کم ازکم ۳۰ ہزار تھے اور جنازۂ حسنؑ پر سدّ راہ ہونے والی جماعت زیادہ سے زیادہ کئی سو ہوگی۔ حسینؑ کے ساتھ عباسؑ بھی موجود ہیں جو اس وقت ۲۲ برس کے مکمل جوان تھے جناب محمد حنفیہ بھی موجود تھے جن کی شجاعت کا تجربہ دنیا کو حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ جمل اور صفین میں ہو چکا تھا۔ مسلم بن عقیل بھی موجود تھے جنہیں بعد میں پورے کوفہ کے مقابلہ میں تن تنہا حسینؑ نے بھیج دیا اور انہوں نے اکیلے وہ بے نظیر شجاعت دکھائی جو تاریخ میں یادگار ہے۔

علی اکبرؑ بھی بنابر قول قوی اس وقت ۱۵ برس کے تھے جو کربلا کے قاسمؑ سے زیادہ عمر رکھتے تھے اور تمام بنی ہاشم موجود تھے۔ پھر کچھ تو آل رسولؐ کے وفادار غلام اور دوسرے اعوان وانصار بھی موجود ہی تھے اس صورت حال میں حضرت امام حسینؑ کے عمل کو بے بسی کا نتیجہ سمجھنا کہاں درست ہوسکتا ہے۔

مگر حسینؑ خاموش رہتے ہیں اور ان سب کو خاموشی پر مجبور رکھتے ہیں امام حسنؑ کا جنازہ واپس لے جاتے

ہیں جنت البقیع میں دفن کر دیتے ہیں اور اس کے بعد دس برس حسنی صلح کے مسلک پر خاموشی کے ساتھ گزار دیتے ہیں اور اس طرح یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ بڑے بھائی کا دباؤ یا مروت اور احترام کا تقاضا نہ تھا بلکہ مفادِ اسلامی کا لحاظ تھا جس کے وہ بھی محافظ تھے اور اب یہ اس کے محافظ ہیں۔

اور ادھر حکومت شام کی طرف سے اس تمام مدت میں ہر ہر شرط کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔

چُن چُن کے دوستانِ علیؑ کو قتل کیا جارہا تھا اور جلا وطن کیا جارہا تھا۔ کیسے کیسے افراد؟ حجر بن عدی اور ان کے ۱۶ ساتھی۔

یہ دمشق کے باہر مرج عذراء میں سولی چڑھا دیئے جاتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ یہ حجر بن عدی فضلائے صحابہ میں سے تھے۔ مسائل فقہیہ میں ان کے فتاویٰ جمع کئے جائیں تو ایک جزو کا رسالہ ہوجائے۔ مگر علیؑ کے دوست تھے اس لئے ان کی صحابیت بھی کام نہ آسکی۔ کوفہ سے قید کر کے دمشق بلوائے گئے۔ حاکم شام نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے پوچھ گچھ یا صفائی پیش کرنے کا موقع بھی دینا پسند نہ کیا۔ حکم ہوگیا کہ بیرونِ شہر ہی روک دیئے جائیں اور وہیں سولی دے دی جائے۔ ان کی شہادت اتنی دردناک تھی کہ عبداللہ بن عمر نے اس کا ذکر سنا تو چیخیں مار کر رونے لگے۔ ام المومنین عائشہ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہا۔

آخر معاویہ خدا کو کیا جواب دے گا، کہ ایسے ایسے نیکوکار مسلمانوں کا خون کر رہا ہے۔

عمرو بن الحمق الخزاعی وہ بزرگوار تھے جنہیں پیغمبرؐ خدا نے غائبانہ طور پر اپنے سلام سے سرفراز کیا تھا ان کا سر کاٹ کر نوک نیزہ پر بلند کیا گیا۔ یہ سب سے پہلا سر تھا جو اسلام میں نیزہ پر بلند ہوا۔

ان حوادث سے عبداللہ بن عمر اور عائشہ بنت ابی بکر ایسے لوگ اس قدر متأثر تھے تو حسینؑ بن علیؑ جن کے والد بزرگوار کی محبت کی پاداش ہی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا جتنا بھی متأثر ہوتے کم تھا۔

پھر حضرت امام حسنؑ کے دس سال تک سکوت اور عدم تعرض کی جو قیمت ان کو ملی یعنی زہر قاتل اور کلیجے کے بہتر ٹکڑے اور پھر ان کی وفات پر دمشق کے قصر سے اظہارِ مسرت میں اللہ اکبر کی بلند آواز۔ ان سب باتوں کے بعد حضرت امام حسینؑ کی خاموشی۔ کیا کسی میں ہمت ہے جو اس وقت کے حسینؑ پر جنگجوئی کا الزام عائد کر سکے؟

اب اس کے بعد وہ ہنگام آیا جسے امام حسینؑ کی آنکھیں بیس برس پہلے دیکھ رہی تھیں یعنی حاکم شام نے اپنے بیٹے یزید کی خلافت کی داغ بیل ڈال دی اور اس کے لئے عالم اسلام کا دورہ کیا۔

اب امام حسینؑ کے لئے وہ شاہراہ سامنے آگئی جو انکارِ بیعت سے شروع ہوئی اور آخر تک انکارِ بیعت ہی کی شکل میں قائم رہی۔

پھر اس انکارِ بیعت کو کیا کوئی وقتی، جذباتی فیصلہ یا ہنگامی جوش کا نتیجہ سمجھا جاسکتا ہے؟

یا درکھنا چاہئے کہ انکارِ بیعت تو ابھی تک کبھی قانونی جرم قرار بھی نہ پایا تھا۔ خلافتِ ثلٰثہ میں بہت سوں نے بیعت نہیں کی۔

حضرت علیؑ کے دور میں عبداللہ بن عمر نے بیعت نہیں کی اسامہ بن زید نے بیعت نہیں کی سعد بن ابی وقاص نے بیعت نہیں کی۔ حسان بن ثابت نے بیعت نہیں کی۔ مگر ان بیعت نہ کرنے والوں کو واجب القتل نہیں سمجھا گیا۔

امام حسینؑ نے بیعت نہ کر کے اپنے کو حمایت باطل سے الگ کیا بس۔ اس کے علاوہ کوئی اقدام نہیں کیا۔ مگر معاویہ کے بعد جب یزید برسر اقتدار آیا تو اس نے پہلا ہی حکم اپنے گورنر ولید کو یہ بھیجا کہ حسینؑ سے بیعت لو اور بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کر کے بھیج دو۔ یہ تشدد کا آغاز کدھر سے ہو رہا ہے؟ حاکم مدینہ کو اس حکم کی تعمیل کی ہمت نہ ہوئی تو اسے معزول کیا گیا۔ امام حسینؑ کو اگر تشدد سے کام لینا ہوتا تو آپ ہلاکت معاویہ کی خبر ملتے ہی مدینہ کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیتے جو اس وقت ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ اس کے بعد کم از کم عالم اسلام تقسیم تو ہو ہی جاتا مگر آپ ایسا نہیں کرتے بلکہ جا کر مکہ میں پناہ لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں کسی کی جان لینا نہیں ہے اپنی جان بچانا منظور ہے۔ یہ ''ہم وجودی'' کا عملی پیغام ہے۔

بظاہر اسباب اگر یہاں قیام کا ارادہ مستقل نہ ہوتا تو احرام حج کیوں باندھتے؟ احرام باندھنا خود نیت حج کی دلیل ہے اور نیت کے بعد بلاوجہ حج توڑنا جائز نہیں۔ حضرت امام حسینؑ سے بڑھ کر مسائل شریعت سے کون واقف ہوگا اور یہ ان کا مخالف بھی خیال نہیں کر سکتا کہ وہ جان بوجھ کر حکم شریعت کی معاذ اللہ مخالفت کریں گے اور وہ بھی کب جبکہ حج کو صرف ایک دن باقی ہے۔

وہ جن کا ذوق حج یہ تھا کہ مدینہ سے آ آ کر ۲۵ حج پاپیادہ کر چکے ہیں اب مکہ میں موجود ہوتے ہوئے حج کو عمرہ سے تبدیل فرما دیتے اور مکہ سے روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرز عمل سے خود ظاہر ہے کہ اس کا سبب غیر معمولی اور ہنگامی ہے۔ چنانچہ ہر ایک پوچھ رہا تھا اور بڑی وحشت اور پریشانی کے ساتھ۔ آئیں! آپ اس وقت مکہ چھوڑ رہے ہیں؟

یہ ہر سوال امامؑ کے دل پر ایک نشتر تھا ہر ایک سے کہاں تک بتلاتے۔ کسی کسی سے کہہ دیا کہ نہ نکلتا تو وہیں قتل کر دیا جاتا اور میری وجہ سے حرمت خانۂ کعبہ ضائع ہو جاتی۔

مکہ میں آنا بھی خطرہ کو حتی الامکان ٹالنا تھا اور اب مکہ سے جانا بھی یہی ہے اب آپ کوفہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ جہاں کے لوگوں نے آپ کو اپنی ہدایت دینی اور اصلاح اخلاق کے لئے دعوت دی ہے مگر بیچ میں فوج حُر آ کر سدّ راہ ہوتی ہے اب آپ پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ اس پوری فوج کو جو پیاسی ہے سیراب کر دیتے ہیں۔ یہ فیاضی بھی جنگجویانہ انداز سے بالکل الگ ہے اس کے بعد وہ موقع آیا کہ نہر پر خیموں کے برپا کرنے کو روکا گیا اس وقت اصحاب کی تیوریوں پر بل تھے مگر امامؑ نے فرمایا کہ مجھے جنگ میں ابتداء کرنا نہیں ہے۔ ریتی ہی پر خیمے برپا کر دو یہ نفس پر جبر اور حلم و تحمل وہ کر رہا ہے جسے بالآخر جان پر کھیل جانا اور اپنا

پورا گھر قربان کردینا ہے مگر وہ اس وقت ہوگا جب اس کا وقت آئے گا اور یہ اس وقت ہے جب اس کا وقت ہے۔

پھر عمر سعد کربلا میں پہونچتا ہے تو آپ خود اس کے پاس گفتگوئے صلح کے لئے ملاقات کا پیغام بھیجتے ہیں۔ ملاقات ہوتی ہے تو شرطیں ایسی پیش فرماتے ہیں کہ ابن سعد خود اپنے حاکم عبیداللہ بن زیاد کو لکھتا ہے کہ فتنہ وافتراق کی آگ فرو ہوگئی ہے۔ اور امن وسکون میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ حسینؑ ملک چھوڑنے تک کے لئے تیار ہیں اس کے بعد خونریزی کی کوئی وجہ نہیں۔

اب یہ تو فریق مخالف کا عمل ہے کہ اس نے ایسے صلح پسندانہ رویہ کی قدر نہ کی اور صلح کے لئے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹک کر پیچھے ہٹادیا لیکن اس شرط پر حکومت مخالف راضی ہوگئی ہوتی۔ پھر حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی افتاد طبع میں کسی اختلاف کا تصور کرنے والوں کے تصورات کی کیا بنیاد باقی رہ سکتی تھی اور صورت حال کے سمجھنے کے بعد اب بھی یہ تصورات تو غلط ثابت ہو ہی گئے مگر وہ ابن زیاد کی تنگ ظرفی فرعونیت اور یزید کے منشاء کی تکمیل تھی کہ اس نے حضرت امام حسینؑ پر صلح وامن کے سب راستوں کو بند کردیا۔

پھر بھی جب نویں تاریخ کی سہ پہر کو حملہ ہوگیا تو حضرت نے ایک رات کی مہلت لے لی جسے جنگ کرنا ہی مطلوب تھا وہ التوائے جنگ کی درخواست کیوں کرتا مگر اس ایک رات کی مہلت کو حاصل کرکے بھی آپ نے اپنی امن پسندی کا ثبوت دیا اور دکھلا دیا کہ جنگ تو مجھ پر خوامخواہ عائد کی جارہی ہے میں جنگ کا اپنی طرف سے شوق نہیں رکھتا ہوں

پھر صبح عاشور کوئی دقیقہ موعظہ ونصیحت اور اتمام حجت کا اٹھا نہیں رکھا۔ خطبہ جو پڑھا وہ اونٹ پر سوار ہوکر اس لئے کہ وہ ہنگامِ امن کی سواری ہے گھوڑے پر نہیں سوار ہوئے جو جنگ کے ہنگام کا مرکب ہوتا ہے۔

باوجودیکہ خطبہ کے جو جواب ملے وہ دل شکن تھے مگر اس کے بعد بھی آپ نے اس کا انتظار کیا کہ فوج دشمن کی طرف سے ابتدا ہو اور جب پہلا تیر عمر سعد نے چلۂ کمان میں جوڑ کر اپنی فوج سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ کہہ کے لگایا کہ۔ گواہ رہنا پہلا تیر فوج حسینی کی طرف میں رہا کررہا ہوں۔ اور اس کے بعد چار ہزار تیر کمانوں سے روانہ ہوگئے اور جماعتِ حسینی کی طرف آگئے۔ اس وقت مجبور ہوکر امامؑ نے اذن جہاد دیا۔ اور اس کے بعد بھی خود اس وقت تک جہاد کے لئے تلوار نیام سے نہیں نکالی جب تک آپ کی ذات میں انحصار نہیں ہوگیا۔ جب تک ایک بھی باقی رہا آپ نے شمشیر زنی نہیں کی۔ اور اس طرح پیغمبرؐ کے کردار کی تفسیر کردی۔ جب کوئی نہ رہا اس وقت تلوار کھینچی اور یہ ایسا وقت تھا جب کسی دوسرے میں دم نہ ہوتا کہ وہ جنبش بھی کرسکتا تین دن کی بھوک پیاس اور اس پر صبح سے سہ پہر تک کی تمازت آفتاب میں شہداء کے لاشوں پر جانا اور پھر خیمہ گاہ تک پلٹنا اور پھر بہتر کے داغ، عزیزوں کے صدمے اور ان کی لاشوں کا اٹھانا۔

جوان بیٹے کا بصارت لے جانا اور بھائی کا کمر توڑ جانا اور اپنے ہاتھوں پر ایک بے شیر کو دم توڑتے میں

سنبھالنا۔ اور نوک شمشیر سے ابھی ابھی اسکی قبر بنا کر اٹھنا ۔اب اس عالم میں جذبات نفس کا تقاضا تو یہ ہیکہ آدمی خاموشی سے تلواروں کے سامنے اپنا سر بڑھا دے اور خنجر کے آگے گلا رکھ دے مگر حسینؑ اسلامی تعلیم کے محافظ تھے ظلم کے سامنے سپردگی آئین شریعت کے خلاف ہے حسینؑ نے اب فریضۂ وفا کی انجام دہی اور دشمنان خدا کے مقابلہ کے لئے تلوار اٹھائی اور وہ جہاد کیا جس نے بھولی ہوئی دنیا کو حیدرؑ صفدر کی شجاعت یاد دلادی اور اس طرح دکھا دیا کہ ہمارے اعمال و افعال جذبات نفس اور طبیعت کے تقاضوں کے ماتحت نہیں بلکہ فرائض و واجبات کی تکمیل اور احکام ربّانی کی انجام دہی کے ماتحت ہوتے ہیں ۔ چاہے طبعی تقاضے اس کے کتنے ہی خلاف ہوں۔

یہی انسانیت کی وہ معراج ہے جس کی نشاندہی حضرت امام حسینؑ کے اسلاف کرتے رہے اور وہی آج حسینؑ کے کردار میں انتہائی تابانی کے ساتھ نمایاں ہیں۔

☆☆☆



عزاداری حسین-اوراسلام

آیۃ اللہ العظمیٰ علامہ سید علی حائری اللاہوری صاحب قبلہ طاب ثراہ

تاریخی دنیا میں ایک ایسا ہائلۂ عظیمہ اور حادثۂ جسیمہ گذرا ہے۔جس سے زیادہ مہتم بالشان اور کوئی حادثہ نہیں ہوسکتا یہی وہ ایک حادثہ ہے۔جس سے تقریباً تمام دنیا کے مذاہب کو کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے اس عظیم الشان حادثہ کوجس قدر اسلامی دنیامیں عظمت حاصل ہوئی۔جس سے صغیر وکبیر، برناوپیر آج تک متأثر ہو کر خون کے آنسوں رورہے ہیں اس میں شک نہیں کہ دنیا میں اور بھی بہت سے واقعات حادث ہوتے رہتے ہیں۔اور زمانہ کی گردش کے ساتھ ساتھ ہوتے رہیں گے۔لیکن کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا ہے۔جس سے تیرہ سو برس تک اس کا اثر اس طرح باقی رہے کہ گویا کل کا واقعہ ہے۔

زمانہ میں بڑے بڑے انقلاب ہوئے کفر وضلالت کے سیاہ بادل گھر گھر کر آئے۔خوفناک آندھیاں اٹھیں۔ظلم وستم کے بادل گرجے، بجلیاں چمکیں، یہ کیوں ہوا؟ سب اسلئے کہ زمانہ سے اس یادگارِ حسینؑ مظلوم کومٹا دیاجائے۔مگر جس قدر مخالف کوششیں اس بارہ میں کی گئیں۔اتنا ہی بے سود، بیکار اور لغو ثابت ہوئیں۔اور مخالفین سے کچھ بھی نہ ہوسکا۔

آج بارہ سو برس سے زیادہ زمانہ گزر گیا۔اتنے طویل عرصہ میں زمانہ کی زبردست طاقتوں نے اس رسمِ عزاداری کو بیخ وبنیاد سے اکھاڑ پھینکنے اور بند کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔مگر نتیجہ کیا ہوا۔نہ تو وہ خود رہے اور نہ انکا کوئی نام لیوا ہی باقی رہا۔لیکن مظلوم کربلا شہید نینوا علیہ السلام کا ذکر روئے زمینِ شور وشیرین میں اسطرح چمکا جس طرح تمام عالم میں آفتاب کی کرنیں پس یہ وہ غم ہے جس کی اشاعت خدا کومنظور ہے اور کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی ہے۔

یاد رکھو کہ شہداء عظام کے کارناموں میں ایک خاص کشش مقناطیسی ہوتی ہے۔کیونکہ یہ ان کی شہادت اور موت قوم کے حیات کا باعث ہوجاتی ہے۔اسلئے ہر قوم اپنے قومی شہیدوں کوعزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ان کا خاص احترام کرتی ہے۔انکے کارنامے قومی جوش پیدا کرنے کیلئے خلوت، جلوت اور عام جلسوں میں بیان کئے جاتے ہیں۔اشتہاروں، رسالوں اور کتابوں کے ذریعہ عام ومشتہر کئے جاتے ہیں۔جن سے قوم کو جگانے اور اولوالعزمی پیدا کرنے میں خاص اثر ظاہر ہوتا ہے۔

سب شہدا کے سرور وسردار مظلوم کربلا امام حسین علیہ السلام ہیں جنہوں نے ایسے وقت میں اسلام کو سنبھالا ہے۔جبکہ کشتیٔ اسلام طوفان میں پڑی ہوئی تھی یزید جیسا دشمن اسلام رَاکِبُ الْفُجُوْرِ وَشَارِبُ الْخُمُوْرِ اسلام

اور مسلمانوں کا ناخدا بنا ہوا تھا۔ ایسے وقت میں رسولؐ کا نواسا اٹھا۔ اپنے اہلبیتؑ کو ہمراہ لیا اور کربلا کے لق و دق بیابان میں اپنے اور اپنے اعزا کے خون کو بہا کر اسلام اور اسلام کی طوفانی کشتی کو غرق ہونے سے بچا لیا اور سالکوں کیلئے سفینۂ نجات بن گیا۔ یہ لڑائی کوئی پولیٹکل جنگ نہیں تھی۔ اس میں ملک گیری کا خیال نہیں تھا بلکہ یہ جنگ صرف تحفظ اسلام کیلئے تھی۔ پس پیغمبرؐ اسلام نے اگر اسلام کی بنیاد ڈالی تو حسین علیہ السلام نے اس بنیاد کو دنیا میں قائم اور ثابت کر کے دکھا دیا۔ آپ کی مقدس زندگی آئینہ اسلام ہے۔ ایک مجسم نمونہ ہے کیونکہ آپ کی شہادت سے روحانیت وحق کو فتح مبین حاصل ہوئی ہے۔ اور ضلالت و باطل کو شکستِ عظیم۔ سچ ہے ؎

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
سر دادنہ داد دست در دست یزید
حقّا کہ بنائے لاالٰہ است حسینؑ

فی الوقع دیکھنے میں یہ ایک شعر ہے۔ مگر سمجھنے اور معرفت حاصل کرنے کیلئے کچھ اور ہی ہے۔ لہٰذا جس طرح اسلام کو پھیلانا اور لوگوں کو اس کی دعوت دینی ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اسی طرح عزاداری امام حسین مظلوم علیہ السلام کی اشاعت کو ضروری اور فرض عین سمجھ لینا چاہیئے کہ یہی وہ ذریعہ ہے جو بغیر کسی محنت بغیر کسی دقت اور بغیر کسی مشکل کے تبلیغ حق کا کام آہستہ آہستہ کرتا رہتا ہے۔ اور مخالف اسلام قوموں میں اسکا اثر ہوتے ہوئے اس قدر مستحکم ہوتا ہے کہ کچھ زمانہ جانے پر وہ قومیں محض اس عزاداری کے تاثرات سے ہی حلقۂ اسلام میں داخل ہوجاتی ہیں۔



دنیا کی بلندترین ہستی

ذاکر شام غریباں سرکار عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب مجتہد طاب ثراہ

جب سے ابتدائے انسانیت ہوئی اور اشرف المخلوقات نے بزم ہستی میں قدم رکھا اس وقت تک اس خاک دان ہست و بود میں ہزاروں ہی ایسی بلند ہستیاں بزم شہود میں آئیں جن کے اعمال و افعال، اخلاق و عادات خدمت حق اور اطاعت احکام کو خالق نے تمام بلند و پست عالم میں اتنا نمایاں پیش کیا کہ ہزاروں برس گذرنے کے بعد بھی انقلاب زمانہ کی دست درازیوں کی یاد دلوں سے نہ مٹا سکی اور کبھی نہ کبھی بھولنے والوں کے عالم خیال میں ان کی تصویریں اپنے روشن خد و خال کے ساتھ گردش کر ہی جاتی ہیں۔ جن میں علمی جلوہ گاہیں بھی، اور عملی بھی ہیں فکر و خیال کے پر کیف منظر بھی ہیں اور بے نظیر سوج بوجھ کے مرقع، سیاست مدن کی راہنمائیاں بھی ہیں اور ناموس شریعت کی ہدایتیں بھی،

وہ ہستیاں بھی دنیا کی پیش نگاہ ہیں جو محض عالم ظاہری کی حد بندیوں کے اندر قابل تقلید کردار کے مالک تھے اور وہ بھی جو منزل فانی سے آگے بڑھ کر دار باقی کی راہوں کے سالک رہے مگر جس کو دیکھئے اس کے لائحہ عمل کے آئینہ میں یا محض دنیا نظر آتی ہے یا محض دین، صرف سیاست نظر آتی ہے یا شریعت، فقط ظاہر نظر آتا ہے یا باطن، صرف نظر کی بلندیاں ملتی ہیں یا محض عمل کی، لیکن ایسی ہستی عالم معنیٰ میں کمزور نگاہ نے تلاش کی تو کوئی نہ ملی۔ جس کے ایک عمل بدل دینے سے پہلو بدلتے جائیں۔

تصویریں بدلتی جائیں، نقش و نگار بدلتے جائیں پھول ایک ہو مگر خوشبو ہر قسم کی موجود، آئینہ ایک ہو کر مگر ہر تصویر کی جلوہ گاہ، آفتاب ایک ہو کر مگر ہر رنگ کی شعاؤں کا منبع، نقطہ ایک ہو مگر دائرۂ فکر کا مرکز البتہ ایک، حسینؑ اور محض حسینؑ جس کو قدرت نے اپنے جمال بلکہ کمال کا وہ بے نظیر آئینہ بنایا تھا جس نے لباس بشری پہن کر بزم انسانی کو زینت دی اور اخلاق الٰہی سے متصف ہو کر ہر کمال کا منظر پیش کیا۔ وہ حسینؑ نہیں جو صرف شیعوں کے امام بلکہ وہ حسینؑ جو چشم و چراغ عرب، وہ حسینؑ جو آسمان اوج قریش، وہ حسینؑ جو نور نگاہ ہاشم، وہ حسینؑ جو پارۂ قلب محمدؐ عربی۔ سر ورقلب علیؑ، زینت آغوش سیدۂ زنان عالم، منبع امامت، مقصد ذبح عظیم، وہ حسینؑ جس کو خدا نے شہادت کے واسطے چنا، رسولؐ نے اپنے دین کی حفاظت کے واسطے، علیؑ نے اپنی شجاعت کا وارث قرار دیا، ماں نے اپنی عصمت کا مستحق بنایا۔

حسنؑ نے اپنی نیابت کے واسطے چھانٹا۔ عالم اسلام نے امامت کی سند عطا کی۔ یزید نے اپنے مظالم کا مرکز بنایا، تلواروں نے حد برداشت آزما کے دیکھا، نیزوں

نے دل کی گہرائیوں کوٹٹولا، تیروں نے مہمان نوازی آزمائی، پیاس نے تحمل کی حدیں دیکھیں، حد سے بڑھتی ہوئی گرمی نے خنکیٔ ایمان سے مقابلہ کیا، یزید کے ٹڈی دل لشکر نے ثابت قدمی کا امتحان لیا۔ یہاں تک کہ آخر کربلا کی زمین نے اپنی آغوش تمنا میں لے کر سکون واطمینان کی نیند سلا دیا اور دنیا اس مظہر کمال قدرت کے حالات، اخلاق، کردار، علم و عمل کی بلندی دیکھکر محو جمال ہوگئی۔

یہی وہ ذات ہے جو ہر تفریق سے بلند، ہر حد بندی سے باہر، ہر تقسیم سے بالاتر، تمام قوموں، جماعتوں، ملکوں بلکہ ہر عالم کا نقطۂ نگاہ مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کا امام، بہادری کے اعتبار سے ہر لشکر کا علمدار، سیاست کے اعتبار سے بڑے سے بڑا لیڈر، اخلاق کے لحاظ سے تمام دنیا کا رہبر، کردار کی حیثیت سے حکمت عملی کا معلم، عصمت کے لحاظ سے ہر مذہب کا انسان کامل۔

ہمارے نزدیک یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ امام حسینؑ نے اپنی تمام عمر میں جو قدم بھی اٹھایا وہ حدود دین الٰہی کے اندر اور جو عمل بھی کیا وہ اپنے خالق کے بنائے ہوئے دستور العمل کے مطابق۔ عمل کا مشیت خالق کے مطابق ہونا حسینؑ ہی کا کام تھا اور نتائج کی ذمہ داری کا بار صرف خالق کی قدرت پر تھا مگر عمل کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر نگاہ تلاش کو اپنا مطلوب اس سید وسردار جوانان جنت کی سوانح عمری میں کچھ ایسے بے نظیر انداز سے مل گیا کہ ہر باخبر انسان حسینؑ کے کردار کو اپنی راہ عمل بنانے کے واسطے خوشی سے تیار ہوگیا۔

عالم انسانیت میں یہ شان صرف حسینؑ ہی کی ہے کہ جتنا جتنا زمانہ گذرتا جاتا ہے اتنا ہی اتنا رنگ شہادت نکھرتا جاتا ہے اور حسینؑ کی قربانی میں تازگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ آج سے چند صدی قبل مسلمانوں کے علاوہ کب کسی غیر نے اس مظلوم کے کارناموں سے سبق لینے کی اپنے پیروؤں کو تعلیم دی تھی مگر اب تیرہ سو سال گذرنے کے بعد رنگ شہادت اتنا روشن ہوا کہ ہر مذہب والا، ہر ملت کا پیروکار، ہر قسم کی سیاست کا شیدا اپنی قوم اور اپنی جماعت کے سامنے حسینؑ کی مثال پیش کرنا اپنی تبلیغ کا جزو اعظم سمجھ رہا ہے۔

اگر مناسبت محل اجازت دیتی تو میں بلا مبالغہ سیکڑوں ایسے لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کے نام اور ان کے اقوال پیش کرسکتا تھا جو حسینؑ ابن علیؑ کی تقلید، ان کی پیروی اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی دنیا سے فرمائش کر چکے اور فرمائش کر رہے ہیں۔

نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ اتنی گنجائش ہے نیز اس وجہ سے کہ میرا مذکورۂ بالا بیان کم از کم ہندوستان میں تو قابل انکار نہیں۔

کیا دنیا میں کوئی اور بھی ہستی ایسی پیش کی جاسکتی ہے جو یوں تمام اقوام عالم اور مذاہب عالم کے واسطے راہبر بن سکی ہو۔

نہیں ہرگز نہیں۔ یہ حسینؑ ہیں صرف حسینؑ جن کے مصائب کی یاد تازہ کرنے کا زمانہ محرم ہے اور اسی ماہ محرم سے سن ہجری کی ابتدا ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ دنیا کے انصاف پسند حسینؑ اور ان کے ماننے والوں کو ہرگز نہ بھولیں گے جو سب کے سب مظلوم کے فدائی اور ظالم کے دشمن ہیں۔

☆☆☆

مجالسِ عزا اور سیرت سازی

صفوۃ العلماء پروفیسر مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ رحمت مآب

خداوند عالم نے انسان کی ہدایت کیلئے انبیاء ومرسلین کا سلسلہ قائم کیا۔ کتابیں نازل فرمائی۔ شریعتیں بھیجیں جن میں سب سے آخر اور کامل ترین شریعت وہ ہے جس کو خاتم النبین حضرت محمد مصطفیٰؐ کے ذریعہ سے بھیجا گیا۔ دور اور زمانہ کے لحاظ سے شریعتیں بدلتی گئیں۔ دین ایک ہی رہا۔ جیسا کہ ارشاد ہے ''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ'' اللہ کے نزدیک دین بس اسلام ہی ہے۔ جناب ابراہیمؑ اور جناب یعقوبؑ کے متعلق یہ تصریح ہے کہ آپ نے اپنی اولادوں سے یہ وصیت فرمائی کہ تمہیں اسلام پر موت آئے۔ تو معلوم ہوا کہ رسالت مآبؐ سے پہلے بھی جس دین کی تبلیغ کی جاتی رہی ہے وہ اسلام ہی تھا۔ شریعتوں کی تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے فروعی احکام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ خود شریعتوں کا بدلنا اس بات کی دلیل ہے کہ خداوند عالم کے احکام میں اغراض ومقاصد پیش نظر ہوتے ہیں۔ اگر اغراض ومقاصد کے پیش نظر شریعت کے احکام نہ ہوتے تو زمانے کے بدلنے سے۔ حالات کی تبدیلی سے شریعت کی تبدیلی کے کوئی معنی نہیں ہوتے خود شریعتوں کا بدلنا اس نظریے کو باطل قرار دیتا ہے جس میں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کے احکام اغراض اور مقاصد کے پیش نظر نہیں ہوتے۔ حقیقت میں کوئی اچھائی اور برائی نہیں ہے جسکا لحاظ کر کے اللہ نے کسی بات کا حکم دیا ہو یا منع کیا ہو بلکہ وہی اچھا ہے جو اللہ کہہ دے اور وہ برا ہے جسکی اللہ ممانعت کر دے اگر وہ جھوٹ کو واجب کر دیتا تو جھوٹ اچھا ہوتا اور اگر سچ کو منع کر دیتا تو سچ برا ہوتا۔ یعنی اچھائی اور برائی کی بنیاد اللہ کا حکم اور اس کی ممانعت ہے۔ اس کو قطع نظر کرتے ہوئے واقعہ میں نہ کوئی چیز اچھی ہے نہ کوئی چیز بری۔ لیکن اگر یہ نظریہ درست ہو تو پھر خود احکام کے تبدیلی کی بنیاد کیا قرار پاتی ہے۔ حالات وواقعات کے بدلنے سے احکام میں کیوں تبدیلی کی گئی۔ قرآن مجید بھی تصریح کر رہا ہے کہ خداوند عالم کے احکام بے مقصد نہیں ہوتے۔ جیسا کہ روزے کے بارے میں ارشاد ہے کہ روزہ اسلئے تم پر فرض کیا گیا ''لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ'' کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔ نماز کیلئے ارشاد ہے ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ'' نماز ہر طرح کی کھلی اور چھپی برائیوں سے روکتی ہے۔ نماز جماعت کی غرض وغایت یہی قرار دی جاتی ہے کہ مسلمانوں میں اجتماعیت پیدا ہو حج کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ تمام عالم اسلامی ایک مرکز پر متحد ہو۔ ائمہ اہلبیت علیہم السلام سے بھی باکثرت ایسی روایتیں وارد ہیں جن میں شرعی احکام کے اغراض ومقاصد کو بیان فرمایا گیا ہے۔

یقیناً احکام الٰہی کی پابندی سے اجر وثواب اخروی

حاصل ہوگا لیکن یہ ثواب اطاعت کا ہے۔ چونکہ بندہ مومن نے احکام الٰہی کی پابندی کی اس کا ثواب اللہ آخرت میں دے گا جو مختلف عبادتوں کے لئے الگ الگ معین ہے لیکن نگاہ قدرت نے ان احکام کی غرض اخروی ثواب نہیں بلکہ اس نے جو حکم دیئے ہیں وہ انسان کی دنیاوی زندگی کے منافع و مصالح کا لحاظ رکھتے ہوئے دیئے ہیں۔

لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ واقعات کربلا اور مجالس عزاء سے سبق لے کر انسان کو اپنی زندگی سنوارنا چاہئے۔ اپنے اخلاق و کردار درست کرنا چاہئے، شہدائے کربلا کی سیرت کو اپنانے کی کوشش کرنا چاہئے تو اس کو کوئی نئی بات اور نیا تخیل نہ سمجھنا چاہئے۔ اہلبیتؑ کی روایات موجود ہیں ''مَنْ جَلَسَ مَجْلِساً یُحییٰ فِیهِ ذِکْرُنَا لَمْ یَمُتْ قَلْبُهُ یَوْمَ تَمُوْتُ فِیهِ الْقُلُوْبُ'' جو شخص کسی ایسی مجلس میں بیٹھے جس میں ہمارا ذکر زندہ کیا جائے تو اس کا دل اس دن جب تمام دل مردہ ہوں گے (یعنی قیامت کے دن) مردہ نہ ہوگا۔

جن احادیث میں فضائل گریہ بیان کیے گئے ہیں ان سے انکار نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ تمام ثواب تو نتیجۂ اطاعت حکم امام میں ملیں گے۔ معصومؑ نے ذکر واقعات کربلا اور مصائب امام حسینؑ پر حکم ہی کیوں فرمایا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا کہ شریعت کے حکم کا مقصد ثواب اخروی نہیں ہوسکتا (کیوں کہ یہ نتیجۂ اطاعت ہے) اب وہ مقصد کیا ہے جس کے پیش نظر یہ حکم دیئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ جب کربلا کے واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں تو ان سے ہمیں ایسے سبق ملتے ہیں جن سے ہم اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں، اپنے اخلاق و کردار کو اس سانچے میں ڈھال سکتے ہیں جو ایک سچے مومن اور مسلمان کا ہونا چاہئے۔ کبھی کبھی یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ اہلبیتؑ تو معصوم تھے۔ امام حسینؑ تو امام تھے، ہم معصوم یا امام تو نہیں۔ ان کی پیروی کیونکر کر سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کی تصریح ہے خدا کسی کے اوپر اتنا بوجھ نہیں ڈالتا جو اس کی برداشت سے باہر ہو۔ اگر معصومین کی پیروی غیر معصوم کے لئے ممکن نہ ہوتی تو اللہ کبھی تمام مسلمانوں کو اتباع رسولؐ کا حکم نہ دیتا پھر کربلا کے آئینے میں تو معصوم کے کردار کے علاوہ کچھ غیر معصوم افراد کی زندگیاں بھی ہمارے سامنے مشعلِ راہ بن کر آتی ہیں۔ کیا کسی نے بھی جناب حبیب ابن مظاہرؒ، جناب مسلم ابن عوسجہؒ اور جناب زہیر قینؒ وغیرہ کے متعلق عصمت کا دعویٰ کیا ہے۔ امام حسینؑ کے ساتھ آنے والوں میں صرف ہاشمی و مطلبی ہی نہیں، صرف قریشی ہی نہیں، صرف عرب ہی نہیں بلکہ روم و حبش کے رہنے والے بھی شامل تھے۔ تقریباً ہر سن کے جوان، بوڑھے اور بچے موجود تھے۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی دیکھئے وہ ایک بے مثال اور لا جواب نمونۂ عمل قرار پانے کے قابل ہے۔ کیا بلند اور اہم مقصد کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کر دینے کی مثال واقعۂ کربلا سے بڑھ کر ملتی ہے؟ کیا اللہ کی عبادت کو کسی حال میں ترک نہ کرنے کا نمونہ یہاں سے بہتر حاصل کیا جاسکتا ہے؟ کیا آپس میں اخوت و ہمدردی و مواسات کا جذبہ اس سے زیادہ کامل ڈھونڈا جا سکتا ہے؟ کیا سچائی پر جم جانے اور صداقت سے سرمو قدم نہ ہٹنے کی مثال یہاں سے

بہتر کہیں پائی جاسکتی ہے؟ کیا ایثار و قربانی کے کربلا سے بہتر نمونے کہیں ملیں گے؟ کیا بڑی سے بڑی مصیبت کر برداشت اور صبر و استقلال میں فرق نہ آنے کا کربلا سے بڑھ کر کوئی واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے؟ کیا امام کی اطاعت اور فرمانبرداری کو ہر شئے پر مقدم کردینے کی مثال یہاں سے بڑھ کر کہیں مل سکتی ہے؟ غرض کربلا کی ایک تصویر ہے مگر ہزاروں رنگ نمایاں ہیں۔

کربلا ایک پھول نہیں گلدستہ ہے، گلدستہ نہیں ایک چمن ہے جس میں اخلاق و کردار کے گلہائے رنگارنگ کے مختلف تختے کھلے ہیں اور ہر ایک اپنے رنگ و بر میں لاجواب و بے مثال ہے۔ یہ تصور بالکل غلط ہے کہ امام حسینؑ ہمارے لئے نجات کا وسیلہ قرار پاتے ہیں جیسے عیسائی جناب عیسیٰؑ کے متعلق فدیہ کا تصور رکھتے ہیں۔ یعنی ہم دعویٰ محبت امام حسینؑ کے بعد بالکل آزاد کر دیئے گئے ہیں جو چاہیں بداخلاقی کریں، دوسروں پر ظلم کریں، اس کے حقوق غصب کریں، احکام اسلامی کو پیروں سے روندیں لیکن جنت کا ٹھیکا ہمارے نام لکھ دیا گیا ہے۔ یقیناً امام حسینؑ ذریعہ نجات ہیں، یقینا امام حسینؑ وسیلۂ بخشش ہیں مگر کس طرح؟ اسی طرح جس طرح حُرکو جہنم سے نجات دے کر جنت کا مستحق بنا دیا۔ یعنی زبانی دعویٰ محبت نہ کرو بلکہ عمل و کردار سے بھی حسینی بننے کی کوشش کرو۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم نے مجالس عزاء کو صرف رسمی چیز بنا لیا ہے۔ ہمارے باپ دادا مجلس کرتے تھے لہٰذا ہمیں مجلس کرنا ہے جو حصہ دس بیس برس پہلے بٹتا تھا وہی بٹنا ہے اگر حصے میں کوئی کمی آ گئی تو دنیا کو منھ کیا دکھائیں گے۔ دوستوں میں ناک کٹ جائے گی تو اب مجلس کیا ہوئی؟ دوستوں میں ناک بچانے کا ذریعہ اور منھ دکھانے کا وسیلہ رہ گئی ہے۔ صبح سے شام تک ایک کے بعد ایک مجلس میں شرکت ہوتی ہے لیکن نہ یہ مقصد لے کر جاتے ہیں کہ کچھ حاصل کرنا ہے اور نہ کچھ تعلیم لے کر اٹھتے ہیں لیکن وہی لوگ جو ماتم کر کے نکل رہے ہیں، جنھوں نے اپنی زبانوں سے ابھی تھوڑی دیر پہلے امام حسینؑ اور شہدائے کربلا کے پاک و پاکیزہ نام لئے تھے جب ان کی گلیوں اور کوچوں میں گفتگو سنی جاتی ہے تو شرم و ندامت سے سر جھک جاتا ہے۔ ہماری قوم اخلاقی اعتبار سے روز بروز گرتی چلی جارہی ہے حالانکہ ذکر حسینؑ سننے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ میرے خیال میں تمام امراض کا واحد علاج یہ ہے کہ حضرات ذاکرین مجالس کو اہلبیتؑ کے اخلاق و کردار کی درسگاہ بنا دیں اور شرکاء بھی مجلسوں میں صرف سننے، واہ واہ، سبحان اللہ کے نعرہ بلند کرنے اور دوسرے کان سے اڑا دینے کی نیت سے نہیں بلکہ مجلس سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے اٹھیں۔ یقینا شہادت حسینؑ نے ہمیں تبلیغ کا ایک بہترین وسیلہ دیا ہے جو کسی قوم کو حاصل نہیں اور وہ ہماری مجلسیں ہیں۔ بس ضرورت اتنی ہے کہ اس وسیلہ اور ذریعہ کا صحیح مصرف کیا جائے۔ تلوار جتنی جوہر دار اور تیز ہوگی غلط استعمال سے برے نتائج نکلنے کا اتنا ہی زیادہ امکان ہوگا۔ لہٰذا اس ذریعۂ تبلیغ کو بھی غلط ہاتھوں میں جانے سے بچانا چاہئے ورنہ بجائے مفید نتائج برامد ہونے کے برے نتائج حاصل ہوتے چلے جائیں گے۔

☆☆☆

نجات دہندہ امت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حسینؑ

آپ کی عظیم قربانی شریعتِ اسلامیہ کا احیاء ہے

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

رسول کی آنکھیں بند ہونا تھیں ۔کہ اسلام پر مصائب کا ہجوم ہوگیا۔اس کے روحانی خصوصیات اور اصلی خط وخال بگاڑے جانے لگے۔اسکے احکام میں تغیر وتبدل اور اسکے رسوم وقوانین میں کانٹ چھانٹ کی جانے لگی۔حقیقی جانشین رسول کہ جو ان کے تعلیمات کا عملی نمونہ اور مکمل نقشہ تھا۔وہ گمنامی وانزداء کے پردۂ غیبت میں مستور ہونے پر مجبور ہوا۔اور کارفرمایان تختِ اسلامی نے مصالح وقت اور سیاستِ حاضرہ کی علمبرداری اختیار کرکے اسلام نہیں، بلکہ مسلمانوں کے ظاہری جاہ وحشم کی فراوانی کو مقدم قرار دیا۔یہ سب کچھ ہوا۔لیکن قانون اسلامی کا ظاہری احترام اور شریعت کی رسمی پابندی اور احکام شریعہ کا پاس ولحاظ انتہائی سختی کے ساتھ جاری تھا۔ اور اسلئے ان اشخاص کیلئے جو اسلامی تعلیمات سے صحیح طور پر اثر پزیر ہوں۔ان پر مذہب ہی پر قائم رہنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔نیز پابندیٔ شریعت کے بلند بانگ دعوےٰ سے فائدہ اٹھا کر حقیقی رہنمائے اسلام کو پردہ ہی پردہ میں رہ کر ذمہ داران سلطنت سے مفادِ اسلامی کے تحفظ اور احکام شرعیہ کے اجرا کرانے کا بھی موقع مل جایا کرتا تھا۔جس کے نظائر وامثال سے تاریخ کے اوراق مملو ہیں کہ کس طرح بیشمار مواقع پر امیر المومنینؑ نے غلطیوں پر متنبہ کیا، جاتی ہوئی جانوں کو بچایا اور مظلوموں کی امداد کی اور پامال ہوتے ہوئے احکام شریعت کی حفاظت میں کامیاب ہوئے۔

یہ نتیجہ کس بات کا تھا،صرف اسکا کہ اسلامی تختِ حکومت کی جانب سے اسلامی شریعت کی پابندی طرہ امتیاز اور سرمایۂ افتخار سمجھی جاتی تھی اور اس کی کھلم کھلا مخالفت آئینِ قانون کے تحت میں جائز قرار نہ دے دی گئی تھی۔عام افراد امت سے بھی شریعت کی پابندی قانونی حیثیت سے لازم تھی۔ بلکہ سلطنت کا قانون شرع ہی کے نام سے رائج تھا۔اگر چہ پردہ، پردہ میں اسکے اندر تراش خراش کردی گئی ہو۔

بیشک یہ صورتِ حال ایسی تھی۔کہ جس کی بدولت دنیا میں اسلام اور اس کی شریعت کا نام باقی رہے۔ اور چاہے اس کا اصلی جواہر روحانیت مفقود ہو جائے۔لیکن اسکے نقش سے صفحۂ ہستی سادہ نہ ہونے پائے۔لیکن افسوس ہے کہ یہ صورت بھی باقی نہیں رہی۔ زمانہ کی آفتاد نظام تدریج کی پابند ہے۔ اور ہر چیز ابتدا میں کم اور انتہا میں زیادہ ہوتی

ہے۔روز وشب کی آمد ورفت اور زمانہ کا امتداد سابق کے ہر نقش کو زیادہ مدہم کرتا جاتا ہے اور شورش انگریزی ومفسدہ خیزی کی آگ کو ہوا دیتا ہے۔بیشک اسلامی آئینہ پر اگر اس دور میں صرف غبار آیا تھا۔تو کچھ عرصے کے بعد وہ غبار جم گیا۔اور تیسرے دور میں اس نے زنگ کی صورت اختیار کی اور آئینہ کے صفاوضیا کو مفقود ہی کر دیا۔

اس زمانہ میں مخالفت شریعت کی آگ اگر سلگی تھی تو پھر وہ دہکی اور آخر میں شعلہ اٹھنے لگے۔اسلامی مملکت میں بنی امیہ کا دور دورہ ہوا۔اور رسولؐ اسلام کا سرمایۂ زندگی ان خون کے پیاسے دشمنوں تک پہونچایا کہ جو اپنے اقتدار وطاقت کے آخری رمق حیات تک اسی سرمایہ کے تباہ کرنے کیلئے جنگ کرتے رہے تھے۔اور آخر تمام قوتیں ختم ہوجانے کے بعد بیکس وبے بس ہو کر سر تسلیم خم کیا تھا۔اب آج حالات کی دستیاری اور قسمت کی یاوری نے انہی کو اس سرمایہ کا نگراں ومتولی بلکہ مالک وخداوند بنا دیا ہے۔پس پھر کیا تھا۔وہ تلواریں کہ جو بدر واحد وخندق میں کھینچ کر کند ثابت ہوئی تھیں۔اور آخر ناکام ہو کر فتح مکہ میں ایک طویل عرصہ تک کیلئے ہزاروں مجبوریوں کے ساتھ نیام میں چلی گئی تھیں۔اب دوسرے لباس میں نیام سے باہر نکل آئیں۔ اور بیدردی سے احکام اسلامی کا گلا کاٹا جانے لگا۔اس وقت پردہ تھا اور نہ کوئی حجاب، علانیہ شریعت کی مخالفت ہوتی تھی۔ اور اسپر ناز تھا۔اسلام کو پامال کیا جاتا تھا۔اور اس پر فخر تھا۔ اسلامی رہنماؤں کی زبانوں پر پہرے بیٹھے تھے۔اور دہنوں میں قفل لگے ہوئے تھے۔اور اگر وہ ان تمام موانع کے باوجود رہنمائی کے فرض کو انجام دیتے بھی تو بیکار اس لئے کہ دوسری طرف والوں پر قفل تھے۔

بے ساز وسامان ہدایت، مظلومی وبے بسی کے ساتھ ہدایت، حجاب خفا میں مخفی رہ کر ہدایت، جس کا سلسلہ پہلے دور میں جس کا حوالہ سابق میں گذر چکا، جاری تھا۔ وہ اس زمانہ میں ناممکن تھی اسلئے کہ اب تو احکام شریعت کا زبانی بھی پاس ولحاظ نہ تھا۔ بلکہ اسلام وشریعت اسلام کی مخالفت میں طاقت واقتدار کا مظاہرہ تھا۔اَلنَاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ

عوام کے خلاق وحالات پر بالادست طاقتوں کا بجلی کی روک سے زیادہ تیز اثر پڑتا ہے۔حکام وقت کے احکام مذہب سے مخالفت بلکہ اعلان جنگ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام عالمِ اسلامی میں مذہب کی طرف سے بے توجہی اور احکام مذہبی میں تساہل وبے اعتنائی اور معارف صحیحہ سے بےخبری وبے تعلقی کا دور دورہ ہوجائے۔اور مسلمان اسلام سے ہزاروں اور لاکھوں کوس دور جا پڑیں۔جسکا لازمی نتیجہ ہلاکت ابدی ہے۔اور چونکہ اخلاف اسلاف کے قدم بقدم ہوتے ہیں۔خشت اول کے کج ہو جانے کے بعد ستارہ ثریا تک دیوار کج ہی ہوجائے گی۔اسلئے ایک عصر میں اسلام کی فنا اور افراد اسلام کی ہلاکت قیامت تک کیلئے امت رسالت مآب کی ہلاکت کے مترادف ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام کی حیات وموت کا سوال درپیش تھا۔اور امت اسلامیہ کے افراد کی قیامت تک کیلئے ہلاکت کا مرقع سامنے آ گیا تھا۔اور امت محمدیہ تیزی کے ساتھ

آتش جہنم کی طرف قدم بڑھاتی تھی بے شک ضرورت تھی اس وقت ایک نجات دہندہ کی، ایک ایسے شخص کو جو امت رسولؐ کو آتش جہنم سے چھٹکارہ دے۔ اور ہلاکت کے خوفناک سمندر میں غرق ہونے سے بچالے۔

اس ضرورت کا احساس کیا حقیقی رہنمائے اسلام حسین ابن علیؑ نے، حسینؑ اس بات کا بیڑا اٹھا کر اٹھے۔ کہ جان جائے مگر امتِ رسولؐ کو عذاب الٰہی سے نجات دیدوں۔ اسلام کو زندہ کروں۔ اور مسلمانوں کو ہلاکتِ ابدی سے بچاؤں۔

انھوں نے اس مقصد کیلئے دنیا کے عظیم ترین مصائب کو برداشت کر کے کربلا کے دل دوز مرقع کو اپنے اور اپنے اعزا و اقارب کے خون سے ہمیشہ کے لئے رنگین کر دیا۔ اور تاریخ عالم کے ورق کو اپنی مظلومیت کے تذکرہ سے قیامت تک کو مرقع ماتم بنا گئے۔

انھوں نے یہ سب کس کے لئے کیا، ہمارے لئے، لیکن کن معنی سے؟ اس معنی سے کہ وہ اپنی اس عظیم قربانی کے ذریعہ سے شریعت اسلامیہ کا احیاء کر رہے تھے اور احکام شریعت کی تجدید ظلم و استبداد کی طاقتوں کو جو اسلام کی مٹانے والی تھی۔ فنا کر رہے تھے۔ اور احساسات اسلامی کو بیدار اور اسطرح وہ ہمیشہ کیلئے ایک قوم کی تشکیل کر رہے تھے۔ یعنی حیات ثانیہ دے رہے تھے۔ کہ جو نجات کی مستحق اور جنت میں جانے کے لائق ہو۔ اور شریعت اسلامیہ کی پابندی اور احکام مذہبی کی نگہداشت کا باعث، حقیقی طور پر امت مرحومہ کہنے کے قابل ہو۔ اسی اعتبار سے حسینؑ نجات دہندۂ امت تھے۔ اور اسی معنیٰ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ ہمارے لئے شہید ہوئے انکا مقصد یہ تھا کہ افراد اسلام سچے معنی میں مسلمان اور تعلیمات اسلام کا مکمل آئینہ اور پابندیٔ احکام شریعت اور اطاعت الٰہی کا نمونہ بن جائیں۔ ان کے نجات دہندہ ہونے کا کوئی ایسا مفہوم قرار دینا درست نہیں جو ان کے مقصد کو پامال کر دے اور افراد ملت میں پابندی احکام شریعت کے جذبہ کو فنا کی حد تک پہونچائے۔

☆☆☆



کیا رونا بدعت ہے؟

آیۃ اللہ سید باقر نقوی دام ظلہ دبئی

ملتوں اور قوموں کا ایک نیا سال اور اس کا پہلا دن ہوا کرتا ہے اور اس نئے دن کو روز عید کا نام دیا جاتا ہے ،اس نوروز کا افتتاح خوشیوں ،شادمانیوں اور اس کا استقبال نت نئی رنگ رلیوں سے ہوتا ہے۔

کیا مسلمانوں کا نیا سال بھی اسی آن بان سے آتا ہے؟نہیں اور بالکل نہیں۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ سنہ ہجری کا آغاز محرم سے ہوتا ہے۔ہوسکتا ہے ۶۱ھ سے پہلے یہ مہینہ خوشی اور انبساط کو اپنے ساتھ لاتا ہو مجھے انکار نہیں، مگر ۶۱ھ سے سال نو کا نیا دن ،رنج وغم ،آہ وفغاں ،نالہ وشیون اور واویلاہ کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔

بجائے شادمانیوں کے واحسینا واحسینا کی فلک شگاف صداؤں سے ہلال محرم کا استقبال کیا جاتا ہے۔

وہ داستان غم جس کی ابتدا وفات رسولؐ سے ہم گریباں اور خاتمہ دس محرم کو ہوا، جب رسولؐ کے چھوٹے نواسے حسینؑ کوان کے بہتر ساتھیوں سمیت وحشیانہ طریقہ پر شہید کرڈالا گیا ،صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ حق پرست اور حقیقت شناس، ہر انسان اس کی یاد سال بہ سال مناتا ہے۔

کوئی سنگ دل اور پتھر جگر جو حسینؑ کی اس فاجعہ غم کو سنے اور پھوٹ نہ پڑے ،تاثر ایک فطری جذبہ ہے جس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ،رونا آدم زاد انسانوں کی فطرت میں داخل ہے، رقت قلب اور رحم دلی ہی تو نوع بشر اور فرشتوں کے درمیان امتیاز کا سبب بنی ہے۔انبیاء ومرسلین نے آہ وزاری، گریہ وبکا کو چہرۂ بشریت کا غازہ بنایا۔رونا بے صبری ہے یا بزدلی، جائز ہے یا ناجائز ،روا ہے یا ناروا،ہمیں نہیں معلوم تو نہ سہی، مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ قرآن رونے والوں کے تذکرہ سے بھرا ہوا ہے۔

کہیں رونے والوں کا ذکر خیر ہے ''وَاِذَا سَمِعُوْا مَآاُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰیٓ اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ'' کہیں باپ کا بیٹے کے غم میں روتے روتے نابینا ہوجانے کا تذکرہ ہے۔''وَابْیَضَّتْ عَیْنَاهُ وَهُوَ کَظِیْمٌ'' حضرت آدمؑ نے فراق جنت یا ترک اولیٰ پر اشکوں کے چشمے بہائے ۔حضرت یعقوبؑ نے فراق یوسفؑ میں چالیس سال روکر ظاہری بصارت کھودی ،جناب ایوبؑ مصائب پر روتے رہے مگر گلہ نہیں کیا،یحییٰؑ نے آنسوؤں سے زمین صحرا تر کرکے رحمت خدا حاصل کی ،جناب عیسیٰؑ نے زمین گیر اپاہجوں، محتاجوں کی حالت زار پر گریہ کرکے مسیحائی پائی۔

اور خود ہمارے رسولؐ جو تمام انبیاء سے افضل ہونے کے باوجود،کبھی ترس خدا سے روئے،کبھی امت کے لئے روئے،کبھی اپنے چچا حمزہؓ پر گریہ فرمایا اور کبھی اپنے بیٹے

ابراہیمؑ کی وفات پر آنسو بہائے، اس کے علاوہ کسی مومن کو خستہ حال دیکھا آبدیدہ ہوگئے، کسی صحابی کو کرب و بے چینی میں پایا رو دیئے۔

انس سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ رسولؐ کے ساتھ آپ کے فرزند ابراہیمؑ کے پاس گیا۔ رسولؐ نے ابراہیمؑ کو گلے سے لگایا، پیار کیا۔ پھر دوبارہ اپنے فرزند کے پاس تشریف لے گئے جب نزع کا عالم تھا یہ دیکھکر رسولؐ کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہوگئے۔ عبدالرحمٰن ابن عوف نے عرض کیا ''یارسولؐ اللہ آپ رو رہے ہیں'' فرمایا ''آنکھ روتی ہے، دل محزون ہوتا ہے مگر ہم کوئی کلمہ زبان سے ایسا نہیں نکالتے جو مرضئ الٰہی کے خلاف ہو۔''

زبیر سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ اپنے فرزند کی لاش لے کر پیدل تشریف لے گئے اور قبر کے قریب بیٹھ گئے، لاش کو قبر میں اتارا اور بغیر آخری دیدار کئے دفن کر دیا، مگر رسولؐ اللہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ صحابہ نے دیکھا تو سب نے رونا شروع کر دیا اور بعض نے کہا کہ یارسولؐ اللہ آپ رو رہے ہیں حالانکہ آپ نے ہمیں رونے سے منع فرمایا ہے۔ فرمایا آنکھ روتی ہے، دل غمگین ہوتا ہے مگر ہم کوئی کلمہ منھ سے ایسا نہیں نکالتے جو رضائے ایزدی کے خلاف ہو۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے اپنی مادر گرامی کی قبر کی زیارت فرمائی اور اس طرح گریہ فرمایا کہ اسے دیکھکر تمام اصحاب جو آپ کے ہمراہ تھے رونے لگے۔ اسامہ ابن زید سے روایت ہے کہ امامہ بنت زینب کا جب آخری وقت تھا تو رسولؐ اللہ تشریف لائے اور فرمایا جو چیز لے لی جائے وہ بھی اللہ کی ہے اور جو دیدی جائے وہ بھی اسی کی ہے اور اس کے بعد آپ روئے۔ ابن عبادہ نے کہا کہ یارسولؐ اللہ آپ رو رہے ہیں اور ہم کو رونے سے منع فرماتے ہیں، رسالتمآب نے فرمایا ''رونا رحم دلی اور رقت قلب کی علامت ہے جو خدا نے اپنے بندوں کے دل میں قرار دیا ہے اور اللہ اپنے بندوں میں انہیں پر رحم فرماتا ہے جو رحم دل ہو۔'' ابن عبادہ کسی مرض میں مبتلا ہوئے جناب رسالتمآبؐ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، وہ غش میں پڑے ہوئے تھے، رسالتمآبؐ نے دریافت فرمایا کہ کیا سعد کا انتقال ہوگیا ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں مرض کی شدت ہے، حضرتؐ نے رونا شروع کر دیا حضرتؐ کو دیکھکر تمام اصحاب رونے لگے، حضرت نے فرمایا کہ اللہ آنکھوں سے آنسو نکلنے یا قلب محزوں ہونے پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا بلکہ اس زبان سے جو کلمات نکلیں گے اس کی وجہ سے عذاب یا رحم فرمائے گا۔

قرآن اور سنت سے یہ پتا چلا کہ رونا نہ بے صبری ہے نہ بزدلی اور نہ مطلق رونا، ناروا، بلکہ رونا شرافتِ بشر کی علامت، اب جو روایتوں میں بعض جگہ پر رونے سے منع کرنے اور رسالتمآبؐ کے رونے کا تذکرہ ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ رسولؐ نے اس قسم کے غم منانے اور گریہ وزاری سے روکا ہے جہاں انسان صبر کا دامن ہاتھ سے دیدے، قضا و قدر خداوندی پر راضی نہ ہو اور اپنے خالق سے شکوے کرنے لگے کہ اے اللہ تو نے ایسا کیوں کیا، جب نعمت چھیننا ہی تھی تو عطا کیوں کی تھی، اے خدا تیرا رحم و کرم

کیوں رخصت ہو گیا اور اے کاش کہ ایسا نہ ہوتا یہ تو ہم پر بہت بڑا ظلم ہو گیا، یقیناً اس طرح رونا، گریہ وزاری کرنا اور واویلا مچانا حرام اور شرافت بشری کے خلاف ہے۔

رسولؐ اکرم جس طرح اپنے فرزند ابراہیمؑ پر روئے، اپنے چچا حمزہؓ وجعفرؓ پر گریہ فرمایا اور امامہ بنت زینب پر آنسو بہائے، اس سب سے زائد اپنے چھوٹے نواسے حسینؑ پر روئے اور رونے کی ہمیں ترغیب بھی دی ہے۔

مسند ابن حنبل کی روایت ہے کہ ''مَنْ بَکَیٰ عَلیٰ الْحُسَیْنِ وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِیْ'' اس کا رشۂ عظمیٰ کے رونما ہونے سے پچاس سال قبل صرف اس کی خبر سن کر رسولؐ اسلام متعدد مرتبہ روئے جس کو علماء ومورخین اسلام نے مختلف مقامات پر درج فرمایا ہے۔

ابوبکر ابن شیبہ نے مقنف میں، عبدالرزاق نے مسند میں اور ابن منصور نے سنن میں روایت کی ہے کہ ''جناب رسالتمآب ایک دن بے اختیار گریہ فرما رہے تھے، جب سبب گریہ دریافت کیا گیا تو فرمایا ''جب سے حسینؑ کی خبر شہادت سنی ہے، میرے آنسو تھمتے ہی نہیں۔'' بیہقی اور ابو نعیم ام المومنین ام سلمہ رضوان اللہ علیہا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسالتمآب ام المومنین کے حجرہ میں داخل ہوئے اور فرمایا کہ دیکھو ام سلمہؓ کسی کو داخل حجرہ نہ ہونے دینا، معلوم نہیں کس طرح حسینؑ حجرہ میں داخل ہو گئے، میں نے حجرہ کے اندر سے رسولؐ کے رونے کی آواز سنی قریب گئی حجرہ کا پردہ الٹا، دیکھا رسولؐ حسین کے بوسے لے رہے ہیں اور زار وقطار رو رہے ہیں، میں نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ خیر تو ہے۔ فرمایا ''شہادت حسینؑ کی خبر جبرئیلؑ لائے تھے۔''

طبرانی نے معجم میں نقل کیا ہے کہ ایک دن رسولؐ خواب سے بیدار ہوئے اور ڈھاریں مار مار کر رونے لگے، عرض کیا گیا خیر تو ہے، فرمایا ''ایک دن میرا حسینؑ شہید کر دیا جائے گا۔''

یاد رہے ابھی حسینؑ شہید نہیں ہوئے ہیں، محض شہادت حسینؑ کی خبریں سنی ہیں اور عظیم سانحہ جو ۶۱ھ میں رونما ہوگا اس کے متعلق صرف یہ سوچ کر رسولؐ گریہ فرما رہے ہیں تو اب کسی مسلمان میں دم ہے جو جرأت کر کے یہ کہے کہ بعد شہادت حسینؑ ان کے ذکر پر رونا بدعت، ناجائز اور بے صبری ہے؟ پھر جبکہ کتاب تاریخ واخبار کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعد شہادت، رسولؐ نے گریہ فرمایا، انسان ہی نہیں، زمین وآسمان یہاں تک کہ بے جان پتھر روئے۔

ترمذی، نسائی، احمد اور حاکم نے جناب ام سلمہؓ سے روایت کی کہ ''حسینؑ کے عراق کی جانب روانہ ہونے کے بعد میں دن رات بے قرار رہا کرتی تھی یہاں تک کہ عاشور کے روز ظہر کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتی ہوں کہ رسالتمآب بحال پریشاں تشریف فرما ہیں۔ چہرہ وریش مبارک غبار آلود ہے، زلفیں بکھری ہوئی ہیں، لباس پر خون کی چھینٹیں ہیں، آنکھوں سے سیلاب اشک جاری ہے۔ آنسوؤں سے ریش مبارک تر ہو گئی ہے اور ہاتھ میں ایک خون بھرا شیشہ ہے جس میں خون تازہ جوش مار رہا ہے میں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ خیر تو ہے میں سرکار کی یہ کیا حالت دیکھ رہی ہوں'' فرمایا ''اے ام سلمہ تم کیا بیٹھی ہو،

صبح سے مقتل حسینؑ میں تھا، امت نے میرے حسینؑ کو میرے سامنے ذبح کر دیا۔ یہ خون اسی کا ہے۔''

مدینہ میں اس محترم خاتون نے یہ خواب دیکھا اور عین اسی وقت مکہ میں جناب ابن عباس جیسی محترم شخصیت نے رسولؐ کو اسی حالت میں دیکھا۔

بیہقی اور ابونعیم روایت کرتے ہیں کہ قتل حسینؑ کے روز آسمان سے خون برسا اور زمین سے اتنا خون ابلا کہ ہمارے برتن سب خون سے بھر گئے۔

بیہقی ہی نے زہری سے روایت کی ہے کہ عاشور کے دن ہر درخت اور پتھر کے نیچے سے تازہ خون نکلتا تھا۔

ان تمام روایتوں نے جو فرزندان اسلام کی کتابوں سے نقل ہوئیں یہ معلوم ہوا کہ سبط رسولؐ کے غم میں آنسو بہانا، سروں پر خاک اڑانا، سرو پا برہنہ ہونا اور مختلف طریقوں سے عزائے حسینؑ قائم کرنا نہ حرام ہے نہ بدعت۔ لیکن ہر قربانی کا ایک مقصد ہوتا ہے اگر وہ مقصد، اس فداکاری پیش کرنے والے سے بلند ہے تو وہ قربانی، شہادت ہے ورنہ ہلاکت۔ دیکھنا یہ ہے کہ حسینؑ کا مقصد کیا تھا؟ اگر حسینؑ کا مقصد یہ تھا کہ یزید اور یزیدیوں کے ترکش ظلم و تشدد کے آخری تیر کو اپنے صبر وضبط اور مظلومی کے سینے پر کھا کر، رقیق القلب آدم زاد نوع بشر کو قیامت تک اپنی ذات پر رُلائیں تو پھر نمازوں کا پڑھنا بیکار، روزہ رکھنا فضول خمس وزکات ادا کرنا غلط اور حج و جہاد نادرست ہوگا، ہمارا چند آنسوؤں کا بہالینا، مقصد حسینؑ کی تکمیل کا ذریعہ ہوگا۔

اے انسان ذرا عقل سے کام لے کیا اس انوکھی اور محیّر العقول فداکاری جو کربلا کے بے آب و گیاہ میدان میں دنیا کے سامنے پیش کی گئیں اس کا مقصد یہی تھا کہ رونے والا کوئی بھی ہو، عزادار حسینؑ جیسا بھی بدکردار، بداخلاق اور تارک عبادات ہو وہ نجات کا مستحق ہے اور جنت اس کی جاگیر ہے، اگر شہادت حسینی کا مقصد یہ تھا تو یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ حسینؑ اسلام کی بقا کے لئے اپنی حیات کا ہر لمحہ قربان کر دینا چاہتے تھے۔ اسلام کو سرخرو رکھنے کے لئے اپنی جان تک سے دریغ نہیں کی۔ وہ اسلام جو ان کو اپنے نانا، رسولؐ کے ہاتھوں ملا تھا اس کی حفاظت کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور آئین شریعت وقوانین اسلام کی حفاظت ان کا نصب العین تھا۔ یاد رکھو حسینؑ کا یہی مقصد تھا جس کے بچانے کے لئے میدان کربلا میں ایک مٹھی جماعت کے ساتھ آگئے، وہ گھر سے بے گھر ہوتے تھے لیکن یہ سننا بھی نہیں چاہتے تھے کہ اسلام دنیا میں ایک نئے اور جھوٹے رنگ میں پیش کیا جائے۔ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی قربانی گوارہ کر سکتے تھے مگر اپنی جان سے زیادہ عزیز چیز، اسلام کو سرسبز دیکھنا چاہتے تھے۔ عزیزان اسلام اور دوستوں، حسینؑ کے مقصد کو سمجھو، تم رو اور چیخیں مار مار کر رو، مجلسیں برپا کرو، علم اٹھاؤ اور ڈیوڑھوں پر ڈیوڑھیں اٹھاؤ مگر جب اذان کا وقت آئے تو فوراً خاموش ہو جاؤ اور کسی قریبی مسجد میں جا کر فریضۂ واجب کی ادائیگی میں مشغول ہو جاؤ اور فریضہ کی فراغت کے بعد اپنی انجمن عزا کو آگے بڑھاؤ، پوری رات واحسینا کی گونج میں شب بیداری کرو مگر نماز صبح سے غافل ہو کر سو نہ جاؤ بلکہ شہزادے علی اکبرؑ کی یاد میں صبح کو اذانیں دے کر نماز

صبح کا فریضہ ادا کرو۔
اس طرح حسینی مشن کی تبلیغ کرو اور ان کے مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنو۔

کربلا کا معرکہ کوئی مادی مقابلہ نہ تھا بلکہ حق اور باطل، نور وظلمت، اسلام وکفر کا مقابلہ تھا۔ ایک طرف بندوں کا بنایا ہوا رہنمائے دین تھا جس کے منھ سے شراب کی بو آتی تھی جس کی حسن پرست طبیعت نے ماں بہنوں کی تمیز اٹھا دی تھی، جو بندروں سے کھیلتا اور کتوں کو لڑاتا تھا، جس کے قصر ابیض میں اذان کی آوازیں، نزد وشطرنج کے پانسوں کی صداؤں میں کھو جاتی تھیں، جس کے اندر لوازم انسانیت کا تو پتہ بھی نہیں تھا مگر شرائط خلافت سب کی سب موجود تھیں اور جس کی کرشمہ سازیوں نے عبداللہ ابن عمر جیسے خلوت پسند کو بھی رام کرلیا تھا، ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ ہاتھ جو یداللہ کی بیعت کے وقت شل ہوگیا تھا، یزید سے مصافحہ کے لئے بڑھ گیا اور وہ سر جو راس رسولؐ کے سامنے تنا رہا، اس شراب خور خلیفہ کے سامنے جھک گیا۔ ایک طرف یہ ننگ بشریت خلیفہ تھا اور دوسری طرف خدا کا منتخب کیا ہوا امام عادل تھا جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملت اسلامیہ کی خدمت کیلئے وقف تھا، جس کا اسوۂ حسنہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتا تھا۔

مختصر یہ کہ ایک طرف شر محض اور دوسری طرف خیر مجسم، ایک طرف بہیمیت تھی اور دوسری طرف انسانیت، ایک طرف خانہ ساز خلیفہ تھا اور دوسری طرف منصوص من اللہ امام۔ گویا خدا و بندہ کا مقابلہ اور یزدان واہرمن کی جنگ حسینؑ اور اصحاب حسینؑ نے کربلا کی سہ روزہ زندگی میں بھوکے پیاسے رہ کر مصائب وآلام برداشت کرکے ظلم وتشدد کا مقابلہ صبر وشکیبائی سے کرکے تمام دنیا پر ثابت کردیا کہ حق کس کی طرف ہے اور باطل کا دامن کون پکڑے ہے، خدائے وحدہ لاشریک کے سامنے کون سر بسجود ہے اور شیطان کا پجاری کون اے شہیدان کربلا تم پر لاکھوں سلام۔ تم نے حفاظت اسلام میں جان دے کر حیات جاوید حاصل کرلی۔

☆☆☆



کارنامۂ حسینؑ کی منفرد خصوصیت

علامہ سید علی محمد نقوی صاحب علی گڑھ

گلشن عالم میں ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک کروروں واقعات کے رنگا رنگ پھول کھلے اور مرجھا گئے۔کوئی جلدی ہی دور خزاں کی نذر ہوگیا،کوئی دیر میں مرجھا گیا،کسی پھول کی خوشبو صرف اسی تک محدود رہی کسی کی ذرا دور تک گئی،اور بعض ایسے پھول کھلے جنھوں نے اپنی خوشبو سے پورے گلستاں کو معطر کردیا،جس سے گلشن کے سبھی باسی فیضیاب ہوئے مگر پھر جب باد خزاں کے جھونکے سنسنائے تو نہ یہ پھول رہ گئے نہ ان کی خوشبو،گلزار کی دوسری نسلوں کو یاد بھی نہیں رہا کہ یہاں کوئی ایسا پھول بھی کھلا تھا۔جس کی خوشبو کے سائے میں ہمارے آبا و اجداد رنج وآلام کے سورج کی نہ جانے کتنی تکلیف دہ کرنوں سے بچ گئے تھے،مگر ان واقعات کے ان گنت پھولوں میں ایک ایسا پھول بھی کھلا ،جس کی خوشبو نہ صرف اسی تک محدود رہی بلکہ گلزار کا کونہ کونہ اس سے بس گیا۔باد خزاں کے جھونکے آتے جاتے رہے،تاریخ کے اوراق پلٹتے رہے،آشیاں بنتے اجڑتے رہے،بجلیاں گرتی رہیں،تباہیاں گلشن کا طواف کرتی رہیں مگر اس پھول کی خوشبو جس طرح تھی اسی طرح قائم رہی۔

یہ واقعہ کربلا تھا:

واقعات واتفاقات وحادثات کے مجموعے کا نام انسان ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں اس کے تناسب سے دوایک قابل لحاظ واقعات ضرور رونما ہوتے ہیں۔مگر ایسے واقعات بہت کم عالم وجود میں آتے ہیں جن کی روشنی اس انسان کی ''تنگنائے ذات'' سے نکل کر دوسرے کے لئے شمع راہ بن گئی ہو۔بعض ایسے عظیم واقعات رونما ہوئے،جن میں ایک حد تک لوگوں نے اپنے درد کا درماں تلاش کیا،مگر یہ واقعات بھی زمانے کی رفتار کا چند صدیوں تک ساتھ دینے کے بعد ماضی کی پر ہول تاریکیوں میں ٹمٹما کر رہ گئے اور کاروان بشر ہی آگے بڑھ گیا۔نئی نسلوں کے لئے یہ گونا گوں واقعات محض نقش ونگار طاق نسیاں بن کر رہ گئے۔اب اگر کسی مورخ نے پرانی تاریخی کتابوں کا عصا اور اپنے علم و عقل کا چراغ لے کر ماضی کی تاریکیوں میں جانے کی ہمت کی تو اسے ان واقعات کی دھندلی دھندلی پرچھائیاں نظر آگئیں اور بس۔مگر یہ کارنامۂ حسینی کی خصوصیت ہے کہ جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے والی نسلوں کے لئے چراغ ہدایت تھا اسی طرح بیسویں صدی کے انسانوں کے لئے ہے۔جس طرح تیرہ سو سال قبل کے انسان واقعۂ کربلا میں اپنے درد کا درماں تلاش کر سکتے تھے اسی طرح آج کی نسل بھی اس میں اپنے زخم کا مرہم ڈھونڈ سکتی ہے۔یہ حسینی کردار کا امتیاز ہے کہ ہم کو اس دور میں بھی توشۂ حیات فراہم کرتا رہا،جب ہم

اسیرِ توہمات تھے، اور آج بھی ہمیں سرمایۂ حیات فراہم کر رہا ہے، جب ہم خواب و خیال کے شیش محل سے نکل کر حقائق کے سورج کی کڑی دھوپ میں سرگرم عمل ہیں، ان منزلوں پر بڑی بڑی جلیل القدر ہستیوں کے کردار پگھل جاتے ہیں، بڑے بڑے اربابِ نظر تھرا کر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، کانپ کانپ کر سپر ڈال دیتے ہیں۔

بڑے بڑے رہنما اصولوں کے سوتے اس انسانی عقل و فہم کی تیز دھوپ میں خشک ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ حسینی اصولوں کے سوتے ہیں جو جیسے جیسے عقل و علم کی دھوپ تیز ہوتی جا رہی ہے ابلتے چلے جا رہے ہیں۔

سوائے واقعۂ کربلا کے کوئی دوسرا واقعہ نہیں جو ہمارا تاریخ کے ہر ہر موڑ پر ساتھ دیتا رہا ہو۔ یہ حسینی کارنامے کی منفرد خصوصیت ہے کہ ہم تیرہ سو سال قبل بھی اپنے مسائل کا حل اس میں تلاش کر سکتے تھے اور آج بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ بیسویں صدی میں انسان جن مسائل سے دوچار ہے ان میں جنگ کی تباہیوں کو روکنے اور دولت و افلاس کے درمیان جو خلیج ہے، اسے پاٹنے کے مسئلے سب سے اہم ہیں۔ جنگ کے خلاف آج ہر طرف امن کانفرنسیں بلائی جا رہی ہیں۔ فلاسفہ و حکماء حل پیش کر رہے ہیں۔ کوئی پُر امن بقائے باہم کا اصول پیش کر رہا ہے، کوئی اہنسا کا درس دے رہا ہے، کوئی ''جیو اور جینے دو'' کی پرانی بات کو اپنی اپنی لفظوں میں دہرا رہا ہے مگر دراصل یہ تمام حل حسینؑ اپنے کردار و گفتار سے آج سے تقریباً چودہ سو سال قبل پیش کر چکے ہیں، جو کربلا کے بن میں خون کی رنگین دھاروں سے لکھے گئے تھے۔ ان پھولوں کا رنگ و روپ دور سے اجنبی محسوس ہوتا ہے مگر قریب جا کر ''ذوقِ نظارہ'' کو قوتِ احساس میں سمو کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خوشبو وہی ہے جو گلدستۂ کربلا سے ۶۱ھ میں اڑی تھی اور جس سے آج تک بعض انسانی مشامِ جاں بسے ہوئے ہیں، ہلالِ محرم نے اپنے سفر کا آغاز ہی کیا تھا کہ شبیری قافلہ اپنی منزل پر پہونچ گیا۔

مہینے کی دوسری تاریخ حسینؑ سرزمین کربلا پر آ گئے، اور تیسری سے یزیدی فوجیں آنا شروع ہو گئیں۔ نو محرم تک کربلا کا ریتیلا میدان افواج یزیدی سے لبالب ہو چکا تھا۔ زمین کثرتِ نفوس سے چھلک رہی تھی، کاروانِ فطرت اپنی عمر میں پہلی بار ظلم و ستم کا اس بڑے پیمانے پر ننگا ناچ دیکھنے کے لئے تیار ہو رہا تھا، اور اس وقت یزیدی افواج کا سردار عمر سعد حسینؑ سے صلح کی بات چیت کرنے میں مصروف تھا۔

امام حسینؑ نے صلح کی جو صورتیں پیش کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مجھ کو ہندوستان یا کسی اور دور دراز ملک میں چلے جانے دو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حسینؑ کی یہ شرط پُر امن بقائے باہم اور ''جیو اور جینے دو'' کے اصول کا سنگ بنیاد نہیں ہے۔

''اگر تم ہماری ذات کو اپنے اور اپنے مشن کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہو۔ اور حق کی آنچ سے تمہارے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں تو ہم تمہاری سلطنت ہی سے باہر چلے جانے کو تیار ہیں، پھر تو تمہارے لئے کوئی خطرہ نہ رہے گا۔''

کیا کوئی ہمیں بتا سکتا ہے کہ ''جیو اور جینے دو'' کا اصول حسینی ارشاد کی صدائے بازگشت نہیں تو اور کیا ہے۔ اور قرآن ناطق حسینؑ کے دہن سے جو پھول بن کر فضا میں بکھر گیا، وہ اس سے پہلے قرآن سامت کے صفحات پر روشنائی بن کر بکھر چکا تھا۔ سورۂ کافرون کی آیت ''لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ'' (تمہارا دین تمہارے ساتھ ہے اور ہمارا دین ہمارے ساتھ) کس کو یاد نہیں۔

پیغمبرؐ خدا تو ارشاد فرما ہی چکے تھے کہ حسینؑ اور قرآن کبھی الگ نہیں ہو سکتے۔ جو قرآن بزبان بے زبانی کہہ چکا تھا وہی حسینؑ نے عمر سعد سے کہا۔

آج کل تشدد کے مقابلہ کے لئے ایک اور ہتھیار کا بڑے زور وشور سے نام لیا جاتا ہے، جس کا تجربہ بظاہر سب سے پہلے ہمارے ہی ملک میں ہوا تھا۔ یہ اہنسا ہے جس میں ظالم کو اپنے اخلاقی جوہروں سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حسینؑ نے واقعۂ کربلا کے سلسلے میں اس ہتھیار سے بھی دنیا کو روشناس کرا دیا۔

وہ موقع ہے جب ابن زیاد حاکم کوفہ کی طرف سے ایک ہزار سپاہی حر کی قیادت میں حسینؑ کا راستہ روکنے کے لئے آئے ہیں۔ لیکن سب پیاس سے جاں بلب ہیں۔ سواروں کے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے ہیں۔ گھوڑوں کی زبانیں منھ سے باہر نکلی ہوئی ہیں۔ عرب کی دوپہر کا غضبناک سورج گویا جہنم کو دنیا پر انڈیلے دے رہا ہے، اور اس صورت حال میں حسینؑ یہ جانتے ہوئے کہ ساتھ میں پھول جیسے بچے اور عورتیں ہیں اپنے قافلے کی مشکیں دشمن کی سیرابی کے لئے کھلوا دیتے ہیں اور یہاں تک پانی پلواتے ہیں کہ جب تک مرکب اور راکب خود منھ نہیں ہٹاتے۔ مشک کے دہانے بند نہیں کئے جاتے۔

کیا اس برتاؤ سے پتھر کا دل بھی نرم نہیں ہوسکتا؟ کیا آج بھی کردار کے ایسے سانچوں سے جنگ آزمائیوں کو مکمل امن وسکون میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کربلا میں جس دشمن سے سابقہ پڑا تھا، وہ انسانیت ہی سے معرا تھا، وہ اپنے ارادوں سے صرف اسی صورت میں باز آسکتا تھا کہ اپنے اصولوں اور مقاصد کے سر، ایک زریں طشت میں سجا کر اس کے سامنے پیش کئے جاتے اور حسینؑ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے اصولوں کی قربانی پیش کر کے ایمان و شرافت حسن وصداقت اور انسانیت، سب کے خون میں اپنے ہاتھ رنگتے۔ تاریخ کی روشنی میں راہ دیکھتے وقت امام حسینؑ کا ایک اور ایسا قول ملتا ہے جو تمام کشمکشوں کا واحد حل ثابت ہوسکتا ہے۔

موقع وہ ہے جب فوج حر کو پانی سے سیراب کرنے کے بعد امام حسینؑ اور حر کے مابین گفتگو کے نتیجے میں طے ہوتا ہے کہ امام نہ کوفے کی سمت جائیں، نہ مدینے کی جانب، بلکہ ایک تیسری طرف جائیں، اور یزیدی لشکر نگرانی کے لئے ساتھ ساتھ رہے یہی تیسرا راستہ فرات کی طرف رہنمائی کرتا تھا، جب حسینی قافلہ اور یزیدی لشکر کربلا پہونچا تو حاکم کوفہ کا حر کے پاس حکم آ گیا کہ حسینؑ جہاں ہیں وہیں روک دو۔ حسینؑ اتر جاتے ہیں اور اپنے جانبازوں کو حکم دیتے ہیں کہ دریا کے کنارے خیمے نصب کرو۔ حر آ کر کہتا ہے کہ

ہمیں تاکید ہے کہ آپ کے قافلے کو ایسی جگہ اتروائیں جہاں نہ پانی ہو نہ گھاس تاکہ حسینی قافلے کے انسان بھی بھوکے پیاسے رہیں اور جانور بھی یہ سنتے ہی اصحاب حسینؑ بپھر جاتے ہیں۔ زہیر بن قینؑ جو قریب ہی کھڑے تھے عرض کرتے ہیں ''مولا'' ہم کو ان سے نپٹ لینے دیجئے ورنہ اس کثرت سے کمک آجائے گی کہ مقابلہ دشوار ہوجائے گا۔

حسینؑ نے زہیرؑ کے اس دوستانہ مشورے کا جواب دیا ہے اگر اسی کو ہر انسان، ہر ملت اور ہر طاقت گرہ میں باندھے اور دل میں اتارلے تو جنگ کے بادل افق جہاں پر سے چھٹ جائیں اور انسان کھلی فضا میں سانس لے سکے۔

حسینؑ فرماتے ہیں، زہیر! میں جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آج ہر ایک صرف اتنا ہی طے کرلے کہ وہ جنگ میں پہل نہیں کرے گا تو جنگ ہو ہی نہیں سکتی۔ حسینؑ کا یہ جملہ آج کے پورے مسئلۂ جنگ کا حل ہے۔ امام حسینؑ نے واقعۂ کربلا کے سلسلے میں جو اصول پیش کئے ہیں۔ اگر انسان ان پر سچے دل سے عمل کرنے کی ٹھان لے تو تمام کشمکش مکمل دوستی اور تمام جنگ آزمائیاں مکمل امن اور تمام اختلافات مکمل ہم آہنگی میں بدل سکتے ہیں۔

آج کی دنیا کا دوسرا سب سے اہم مسئلہ ''مساوات'' کا ہے۔ دنیا میں آج باہمی انسانی تفریق کی نہ جانے کتنی دیواریں کھڑی ہیں۔ کتنے غیر انسانی اور غیر فطری بت پوجے جارہے ہیں، کوئی کالوں کو بنی نوع انسان میں داخل کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے، کوئی بے سہارا اور بیکس لوگوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنا اپنا مذہب خیال کرتا ہے، کوئی ممالک کے ڈھکوسلوں میں گرفتار ہے، دوسرے ملک والے کو گویا خاک کا پتلہ بھی نہیں سمجھتا۔ غرض اب تک ناجانے کتنے دماغوں پر پیسے اور رنگ وروپ کی منحوس حکومت قائم ہے، کتنی عقلوں پر سرمایہ داری کی مہر لگی ہوئی ہے، مگر اب انسان خواب غفلت سے چونک رہا ہے اب اس محدود ''آدمیت'' کا طلسم ٹوٹ رہا ہے، عقائد کی یہ غیر فطری زنجیریں پگھل رہی ہیں۔ ہر طرف سے اس حیوانی جذبہ کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ انسان اس تفریق کے ختم کرنے پر غور کررہا ہے مگر اب بھی وہ کسی حل سے کوسوں دور ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں جو مسئلے کا حل تلاش کررہے ہیں، اکثریت ایسوں کی ہے جن کے ذہنی سانچے قوم پرستی اور سرمایہ داری میں ڈھلے ہوئے ہیں، اسی وجہ سے وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ اسلام نے آج سے صدیوں پہلے دنیا کو پیغام دیا تھا، کہ سب انسان ایک خدا کے خلق کردہ ہیں، چاہے گورے چاہے کالے چاہے عجم چاہے عرب، چاہے مفلس چاہے سرمایہ دار، اس پیغام کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کی ذہنیت ایسی بن جائے کہ وہ اپنے کردار سے کسی قسم کی تفریق کا مظاہرہ نہ کرسکیں آج کے مصلح زبان سے تو بہت کچھ کہتے ہیں، سرمایہ داروں اور قومیت پسندوں کو خوب خوب سناتے ہیں، لیکن اگر شامت اعمال سے کوئی مفلس زدہ حالت میں اطلس وکم خواب کے حریری پردوں کو چھیڑتا اور ریشمی قالینوں کو کچلتا ہوا ان کے شبستان کی محفل طرب میں داخل ہو جاتا ہے تو ان کی

پیشانیوں پر بل آجاتے ہیں، زبان بے قابو ہوجاتی ہے، یہ ان مصلحین کے کردار گفتار کی یکسانیت! جب خود معالج، مرض کا ہمدرد ہوتو مریض کی صحت کا خواب شرمندہ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

واقعۂ کربلا میں حسینؑ نے اپنے کردار سے دنیا کو روشناس کرادیا کہ مساوات کیا شے ہے؟

حسینؑ کے چھوٹے سے قافلے کا ذرا چشم تصور سے نظارہ کیجئے! اس میں ہاشمی نوجوان بھی ہیں اور غیر ہاشمی سورما بھی، عرب بھی غریب غلام بھی قبیلوں کے سرادار بھی، حبشی رنگ بھی اور عربی حسن بھی اور حسینؑ کربلا کے ایسے ہوشربا ماحول میں ان کے درمیان مساوات کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

جو پکارتا ہے امام بہ نفس نفیس اس کے سرہانے جاتے اور کڑیل جوان نور نظر علی اکبرؑ کے سرہانے جاکر ان کا سر زانو پر لیتے ہیں، تو غلام جون کی آواز پر بھی جاکر اس کا سر اپنے زانو پر رکھتے ہیں۔ جنگ کے لئے میدان میں جاتے وقت اگر ماںجائی بہن زینبؑ سے رخصت ہوتے ہیں تو کنیز فضہ کو بھی آخری سلام کرتے ہیں، یہ ہے حسینی کردار!

بیسویں صدی میں دولت و افلاس، سیاہی و سفیدی، عرب وعجم کے درمیان خلیج، نہ ان مصلحین کے غور و خوض سے پر ہوسکتی ہے جن کا قول خود انہیں کے عمل سے ٹکراتا ہے، اور نہ طاقت کے ذریعہ سے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ ہر انسان اپنے خیالات کو شبیری کردار کی کسوٹی پر پرکھے۔ اس میں حسینی اسپرٹ پیدا ہوجائے، اور اس کے ذہن کی رگوں میں کربلا کے شہیدوں کا خون دوڑنے لگے۔

واقعۂ کربلا کو عالم وجود میں آئے تیرہ سو سال سے زیادہ گذر چکے ہیں مگر آج بھی انسان اپنے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کا حل ذات حسینی میں ڈھونڈ سکتا ہے۔ آج بھی انسانی مشام کا رنامۂ حسینی سے معطر ہوکر اس جہان کثیف کو کثافتوں اور غلاظتوں سے پاک کرسکتے ہیں اور ایک ایسا لطیف ماحول بنا سکتے ہیں جس کی طرف عالم بالا کے رہنے والے بھی نگاہ رشک سے دیکھنے پر مجبور ہوجائیں۔



شناخت نفس امارہ و نفس مطمئنہ

حکیم امت ڈاکٹر مولانا سید کلب صادق صاحب قبلہ

کونسی وہ شئی ہے جو آج کے انسان کے قابو میں نہیں آ گئی۔ امراض پر اس نے قابو پالیا۔ بہت سے وہ امراض جو پہلے نا قابل علاج اور موت کی تمہید سمجھے جاتے تھے وہ اب قابل علاج ہو چکے ہیں۔

زمین پر اس نے قابو پالیا انسان نہ صرف یہ کہ زمین کے اوپر دندناتا پھر رہا ہے بلکہ زمین کے سینہ کو چیر کر اس کے خزانوں پر قبضہ کرتا چلا جاتا ہے۔

دریاؤں پر اس نے قابو پالیا بند باندھ کر جدھر چاہتا ہے ان کا رخ موڑ دیتا ہے اور کبھی اس پانی کے زور سے ٹربائینیں چلا کر بجلی پیدا کرتا ہے بجلی بنتی ہے تو گھر روشن ہوتے ہیں، ریڈیو بولنے لگتے ہیں، ٹی وی جگمگانے لگتے ہیں، کارخانے چلنے لگتے ہیں، مشینوں میں جان پڑ جاتی ہے، گاڑیاں دوڑنے لگتی ہیں۔

سمندروں پر اس نے قابو پالیا اس کے بنائے ہوئے دیو پیکر جہاز موجوں کو روندتے پانی کا سینہ چیرتے ہوئے جدھر چاہے بڑھتے چلے جاتے ہیں غوطہ خور کشتیاں سمندر کی تہوں میں ڈوبی ہوئی قعر سمندر میں چھپے ہوئے سربستہ رازوں کو آشکار بناتی چلی جاتی ہیں۔

ہوا پر انسان نے قابو پالیا اس کے بنائے ہوئے ہوائی جہاز اسے لیے ہوئے شہروں شہروں ملکوں ملکوں اڑتے پھرتے ہیں۔

حد یہ ہے کہ خلائیں بھی انسان کے قابو میں آتی چلی جاتی ہیں انسان کے قدم چاند کی زمین کو روند چکے، اب اس کی نظر سیاروں اور کہکشاؤں پر ہے۔

اس ذرہ خاکی نے سائنس کے ذریعہ کس شے پر قابو پا نہیں لیا؟ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک جس سے جب چاہتا ہے بات کرتا ہے، موسم کے سرد و گرم سے بے نیاز ہو چکا ہے ایر کنڈیشنڈ گھروں میں رہتا ہے اور ایر کنڈیشنڈ سواریوں میں سفر کرتا ہے۔ ''کولڈ اسٹورج'' کی بدولت ہر زمانہ اور ہر جگہ کے پھل کھاتا ہے

مختصر یہ کہ ''جسم اصغر'' دھیرے دھیرے ''عالم اکبر'' پر قابو پاتا چلا جاتا ہے مگر حیرت ہے کہ ''عالم اکبر'' کو دھیرے دھیرے اپنے قابو میں لانے والا انسان اگر قابو نہیں حاصل کر پا رہا ہے تو اپنے ہی اس ننھے دل پر جو خود اس کے سینہ میں دھک دھک کر رہا ہے بلکہ صورت یہ ہے کہ دنیا جس قدر اسکے پنجۂ اقتدار میں آتی چلی جاتی ہے دل اسی تناسب سے ہاتھوں سے نکلا چلا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ دل ہی قابو میں نہ ہو تو انسان کیا قابو میں رہے گا! اور انسان قابو میں نہ ہو تو اس کی صلاحیتیں کب قابو میں رہیں گی؟ نتیجہ یہ ہے کہ جس قدر انسان کا اقتدار

بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کی ہلاکت خیزیاں بڑھتی جاتی ہیں، اور نوبت یہ آ گئی ہے کہ پوری نوع انسانی کا وجود ہی خود انسان ہی کے ہاتھوں خطرہ میں پڑ گیا ہے۔

ہر شئے کا علاج انسان نے ڈھونڈ لیا مگر قلب پریشان اور ''نفس مضطرب'' کا علاج انسان کے بس کے باہر دکھائی دے رہا ہے۔ سکون قلب اور طمانینت روح کے لیے انسان گھبرا کر شراب کا سہارا لیتا ہے اور ایک منزل وہ آتی ہے کہ گویا غرق مئے ناب ہو جاتا ہے۔

کبھی جنس پرستی (Sex) کی طرف چل پڑتا ہے تو اس راہ میں ہر فطری حد کو توڑ دیتا ہے، نہ جنس کی قید رہتی ہے، نہ صنف کی، نہ رشتہ کی، نہ سن و سال کی، نہ اپنے کی اور نہ پرائے کی۔

کبھی دولت کی طرف جھپٹتا ہے تو حلال و حرام کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ جعل، فریب، رشوت، ظلم، ستم، قتل اور غارت جس راہ سے بھی دولت مل سکے یہ سمیٹتا چلا جاتا ہے۔

مگر ساری خواہش پوری ہو جانے کے باوجود، دل کی یہ حسرت نکل جانے کے بعد بھی اسے سکون نہیں ملتا تو یہ مسکن دواؤں کا استعمال شروع کر دیتا ہے، خواب آور گولیاں کھانا شروع کر دیتا ہے اور اس کے بعد بھی ذہنی کرب اور اندرونی گھٹن (FRUSTRATION) کم نہیں ہوتی تو ذرا ذرا سی بات پر یا دوسروں کو قتل کر کے ان کی زندگی ختم کر دیتا ہے یا خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے

حیرت ہے کہ بار بار کے تجربہ کے باوجود انسان اس حقیقت کو نہیں سمجھ پا رہا ہے کہ عیاشیاں، دولت سائنس کی نت نئی ایجادیں مادی ہیں، یہ صرف اس کے جسم کو سکون دے سکتی ہیں، روح کو نہیں، قلب کو نہیں، قلب کو، روح کو، نفس کو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے ''ایمان'' سے ''وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ /سورۂ نحل آیت: ۱۰۶'' مالک حقیقی کی یاد سے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورۂ رعد آیت: ۲۸)

تجربہ شاہد ہے کہ مادہ پرست فرد ہو یا قوم، آسائش اور اقتدار کو حاصل کرتی ہے تو نعمتوں اور آسائشوں کے نشے میں قابو کیا انسانیت کے جامے سے باہر ہو جاتی ہے اور حیوانیت کی اس منزل پر پہنچ جاتی ہے کہ جانور بھی شرمندہ ہو جائیں كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (سورۂ علق آیت: ۶) اور نعمتیں جانے لگتی ہیں؛ اقتدار خطرے میں پڑتا ہے، مصیبتیں سامنے آ جاتی ہیں تب بھی انسان ان نعمتوں اور اقتدار کو بچانے کے لئے شرافت اور انسانیت کے سارے حدود چھلانگ جاتا ہے وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ (سورۂ حج آیت: ۱۱)

اس کے برخلاف خدا پرست انسان نہ نعمتوں کے وفور میں حد سے گزرتا ہے نہ مصیبتوں کے ہجوم میں مضطرب و پریشان ہوتا ہے اس کی نظر میں نعمتیں اور مصیبتیں امتحان کے دو پرچے ہوتے ہیں خالق کائنات جن کے ذریعہ انسان کا امتحان لیا کرتا ہے۔ اسے نعمتیں ملتی ہیں تو ان کو امتحان سمجھتا ہے۔ اس لیے ان نعمتوں کو اللہ کے بندوں کی راہ

میں صرف کر کے اجر آخرت کا طلبگار رہتا ہے اور اگر مصیبتوں میں گھرتا ہے تو اسے بھی اپنے لیے ایک امتحان تصور کر کے صبر واستقامت اور عزم واستقلال کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے رضاء پروردگار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے ان دونوں ہی موقعوں پر اس کا نفس مطمئن اور قلب پرسکون رہتا ہے

خلاصہ یہ کہ نفس دوطرح کے ہوتے ہیں ایک وہ نعمتوں کے وفور یا مصیبتوں کے ہجوم میں مضطرب و پریشان ہو کر انسان کو صراط مستقیم سے ڈگمگا دیں دوسرے وہ جو ان دونوں حالتوں میں پرسکون رہ کر انسان صراط مستقیم پر جمائے رکھیں پہلے قسم کے نفس کو مذہبی اصطلاح میں ''نفس امارہ'' اور دوسرے قسم کے نفس کو مذہبی اصطلاح میں ''نفس مطمئنہ'' کہا جاتا ہے۔

نعمتیں اور اقتدار ملنے پر نفس امارہ رکھنے والا انسان کیسا ہو جاتا ہے اگر یہ دیکھنا ہو تو نمرود، فرعون، یزید اور ہٹلر کے اپنے اپنے وقت میں دور اقتدار کو دیکھ لیں اور اقتدار خطرہ میں پڑے، مشکلیں اور مصیبتیں سامنے آ جائیں تو نفس امارہ رکھنے والا انسان کیا ہو جاتا ہے، اس کے لیے بھی آپ انہی نمرود، فرعون، یزید اور ہٹلر کے اس دور کو دیکھ لیں جب ان کا اقتدار خطرہ میں آ گیا تھا آپ دیکھیں گے کہ کبھی ایک انسان کو جلانے کے لئے لاکھوں من لکڑیاں جمع کی جاتی ہیں، کبھی ہزاروں معصوم بچوں کو انکی ماؤں کی گودیوں سے چھین چھین کر ذبح کر دیا جاتا ہے، کبھی کبھی آل رسولؐ پر ایسا ظلم کیا جاتا ہے کہ لفظ یزید ظلم کا ہم معنی بن جاتا ہے اور کبھی ہزاروں کو زندہ جلا کر خود اپنی زندگی کا اپنے ہاتھوں خاتمہ کر لیا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف نفس مطمئنہ رکھنے والے افراد کا کردار ان دونوں موقعوں پر کیا ہوتا ہے اس کے شواہد بھی تاریخ میں موجود ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کو حکومت ملی او رایسی کہ نہ اس سے قبل کسی کو ایسی حکومت ملی نہ اس کے بعد کسی کو ملے گی۔ مگر یہ حکومت ملی تو زبان سلیمان پر دل سے نکلی ہوئی یہ دعا تھی رَبِّ اَوْزِعْنِی اَنْ اَشْکُرَ ...الصَّالِحِیْنَ (سورۂ نمل آیت: ۱۹) ''پروردگارا مجھے توفیق دے کہ میں ہمیشہ شکر گزار ہوں ان نعمتوں کے لیے جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر نازل فرمائیں اور اس حکومت کے بعد میرا طرز عمل میرا طریقۂ کار ایسا رہے کہ تو خوش ہو جائے اور تو اپنے رحم وکرم کے صدقہ میں میرا شمار اپنے نیک بندوں میں کر لے'' خدا کے نیک بندوں کی دعائیں ان کے دلی جذبات اور طرز فکر کی آئینہ دار ہوتی ہیں وہ جس مقصد کے لیے دعا کرتے اس کی راہ میں تن من دھن سے لگ بھی جاتے ہیں۔ خدا کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ اسے خدا کے بندوں کی راہ میں صرف کیا جائے حکومت ملنے کے بعد جناب سلیمانؑ کا یہ عزم اس بات کی دلیل تھا کہ ان کے سینہ میں نفس مطمئنہ ہے نفس امارہ نہیں۔

حضرت یوسفؑ کو مصر پر حکومت ملی تو ظلم وعدوان تمرد وسرکشی کی نمونہ ہوئی جو نفس امارہ کی علامت ہوتی بلکہ آپ عفو وکرم کا نمونہ بن گئے حکومت ملی تو جان کے دشمنوں

کی بھی غذائی ناکہ بندی نہ کی بلکہ قحط پڑا تو کبھی باقیمت اور کبھی بے قیمت سامان غذا فراہم کیا گیا جن لوگوں نے یوسفؑ کے قتل کی سازش کی تھی ان کو معافی ہی نہیں دیدی گئی، اپنے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھلایا گیا۔ یہ کردار نفس مطمئنہ رکھنے والوں کا ہوتا ہے، نفس امارہ رکھنے والوں کا نہیں۔

صاحبان نفس مطمئنہ کے با اقتدار ہونے کی حالت کے کچھ اور مثالی نمونہ دیکھنا چاہیں تو تاریخ کے ان مقامات کی ورق گردانی کریں جب رسولؐ فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے تھے یا امیر المومنینؑ کو دنیاوی اقتدار ملا تھا۔

خطرات کے موقع پر اور مصیبتوں کے ہنگام میں اطمینان نفس، سکون قلب اور عظمت کردار کے نمونہ بھی صاحبان نفس مطمئنہ کی سیرت میں نمایاں ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے جلانے کے لیے آگ روشن کی گئی اور ایسی کہ تاریخ بشر میں نہ اس سے قبل اتنی آگ فراہم کی گئی تھی نہ اس کے بعد کبھی فراہم کی گئی۔ ایک انسان کے لیے اس قدر آگ کا فراہم کرنا اضطراب قلب نمرود کا پتہ دے رہا تھا مگر دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ کو منجنیق میں رکھ کر تیزی سے گھمایا جاتا ہے اور متعدد چکر دے کر آگ کے سمندر کی طرف اچھال دیا جاتا ہے ظاہری حالت میں موت و زندگی میں چند ثانیوں کا فاصلہ رہ گیا ہے، بھڑکتے شعلے قریب سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں ہوا میں قلابازیاں کھاتے جارہے ہیں، نہ ہاتھ قابو میں نہ پیر نہ سر قابو میں نہ دھڑ مگر اس عالم میں بھی جب جبرئیل آکر سوال کرتے ہیں هَلْ لَکَ حَاجَۃٌ؟ خلیل خدا کیا کوئی تمنا ہے؟ کوئی آرزو ہے؟ تو وہ جواب دیتے ہیں جو اس بات کا شاہد ہے کہ جسم چاہے قابو میں نہ ہو مگر صاحب نفس مطمئنہ کا دل و دماغ، نفس سب بالکل اطمینان و سکون کی حالت میں ہے۔ فرماتے ہیں ہے تو تمنا ضرور مگر تم سے نہیں کہوں گا، جبرئیل نے کہا تو پھر جس سے کہنا ہے اس سے کیوں نہیں کہتے، جواب دیا کہ وہ دل کی تحریر خود ہی پڑھ رہا ہے، کہنے کی ضرورت نہیں۔

حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے بچانے کے لئے راتوں رات بنی اسرائیل سمیت مصر روانہ ہو گئے فرعون کو خبر ہوئی تو زبردست لشکر لیکر تعاقب میں روانہ ہوا ابھی بنی اسرائیل بحر احمر کے قریب ہی پہنچے تھے اور سوچ ہی رہے تھے کہ اس سمندری پٹی کو کیونکر عبور کیا جائے کہ فرعون اپنے لشکر کو لیے ہوئے موجیں مارتا ان کے سر پر پہنچ گیا سامنے بھی موت، پیچھے بھی موت بنی اسرائیل لاکھوں تھے مگر گھبرا گئے، ٹھنڈے پسینہ آگئے، بے چین ہو کر کہا اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ (سورۂ شعراء آیت:۶۱) لو ہم تو دھر لئے گئے۔ مگر جناب موسیٰؑ تنہا تھے مگر صاحب نفس مطمئنہ تھے اس لئے کمال اطمینان کے ساتھ جواب دیا کہ: کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ (سورۂ شعراء آیت ۶۲) ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا پروردگار ہے وہ ضرور نجات کی کوئی راہ پیدا کرے گا۔

حضور کریمؐ خطرات کے موقع پر کیسا مطمئن رہتے تھے اس کے لیے امیر المومنینؑ کا ارشاد ملاحظہ فرمائیں ''جب جنگ کا تنور بھرپور بھڑکنے لگتا تھا اور پرجگر افراد تک کو میدان میں ٹکنا دشوار محسوس ہونے لگتا تھا تو ہم کو رسولؐ کے مطمئن چہرہ

کو دیکھ کر صبر و سکون کا درس ملتا تھا۔''

شب ہجرت بستر رسولؐ پر کھنچی ہوئی تلواروں کے سایہ میں آرام کرتے رہنا صاحب نفس مطمئنہ ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

سیرت معصومینؑ کے یہ سارے ہی نمونہ خطرات، شدائد اور مصائب کے مقابلے میں صاحبان نفوس مطمئنہ کے سکون قلب اور طمانینت روح کے بہترین نمونہ تھے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سکون قلب طمانینت روح اور اطمینان نفس کا جو مظاہرہ حسین بن علیؑ نے کربلا کے میدان میں کیا وہ بالکل بے مثال تھا۔

کربلا کے قبل و بعد اللہ کے مقرب بندوں نے مصائب و خطرات میں سکون قلب کا ثبوت بیشک پیش کیا، مگر ہاں امتحان صرف ایک یا چند رخوں سے تھا، خطرات تھے مصائب تھے مگر قابل شمار، یعنی وہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا کیا مصیبتیں پڑیں اور یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون سی مصیبت نہیں پڑی۔

عظیم رہنما وہی ہوتا ہے جو حالات کا صحیح تجزیہ کرے، صحیح علاج تجویز کرے اور پھر علاج کو صحیح طریقہ سے انجام تک پہنچائے مگر تجزیہ، فکر اور عمل کی منازل انسان صحیح طریقہ سے اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جب ان تینوں منزلوں میں حالات کے زبردست دباؤ کے باوجود اس کا دل و دماغ پر سکون اور اطمینان کی حالت میں ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ حسینؑ نے حالات کا بالکل صحیح تجزیہ کیا، بالکل صحیح علاج تجویز کیا اور اس علاج کو صد در صد صحیح طریقہ سے شدید ترین ناگوار حالات میں روبہ کار کیا۔

حسینؑ نے مدینہ میں آنے والے حالات کے متعلق جو پیش بینی کی تھی وہ ادنیٰ جزئیات کی حد تک بالکل صحیح نکلی، جس موقع کے جس طریقۂ کار کا انتخاب کیا وہ بھی صد در صد درست تھا اور اس عمل کے مختلف مراحل کے لیے جن افراد کا انتخاب کیا ی انتخاب بھی محیّر العقول حد تک درست نکلا۔ مدینہ میں کیا ہوگا، مکہ میں کیا ہوگا، کربلا میں کیا ہوگا، بعد شہادت کوفہ اور دمشق میں کیا ہوگا یہ سب گویا حسینؑ اپنی دور رس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے پھر ہر عمل کے لیے حسینؑ نے جس طریقۂ کار انتخاب کیا اس سے بہتر طریقہ کار ممکن نہ تھا اور ہر طریقہ کار کے لیے جن افراد کو منتخب کیا ان سے بہتر افراد ممکن نہ تھے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے مضمون کافی نہیں کتاب کی ضرورت ہے۔

حسینؑ کا نمایاں کمال یہ نہ تھا کہ ہجوم بلا و مصیبت میں خود پر سکون رہے بلکہ حیرت کی بات یہ تھی کہ جن کو حسینؑ نے اپنے ساتھ لے لیا تھا، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں، بوڑھے ہوں یا بچے، آزاد ہوں یا غلام و کنیز، عرب ہوں یا عجم، ان سب کے عزم میں، ارادہ میں، صبر و ثبات میں جذبہ سر فروشی میں حسینی عزم، حسینی ارادہ، حسینی صبر و ثبات اور حسینی جذبۂ سرفروشی یوں جھلک رہا تھا کہ کربلا میں، کوفہ میں، شام میں لشکر حسینی کا ہر سپاہی مرد ہو یا عورت بوڑھا ہو یا بچہ اپنی جگہ پر حسینؑ بنا ہوا تھا۔ کربلا میں زیادہ تر مردوں کو صبر و استقامت کے جوہر دکھانے کا موقع ملا مگر کوفہ و شام میں عورتوں نے صبر و استقامت، عزم و استقلال کے محیّر العقول

کارنامہ پیش کیے اور غیروں تک سے کلمہ پڑھوالیا کہ ''تمہارے مرد بہترین مرد اور تمہاری عورتیں بہترین عورتیں ہیں''

ظاہر ہے جس کے ساتھی محیّر العقول صبر و ثبات کے نمونہ پیش کریں خود اس کا سکون و اطمینان کس شان پر ہو گا، اس کا اندازہ ہر ایک کر سکتا ہے۔

میرے خیال میں کربلا کی سب سے سنگین قربانی وہ تھی جو بظاہر سب سے زیادہ سبک تھی، جب ایک چھ ماہ کا بچہ حسینؑ کی گود میں خون میں نہا گیا تھا مگر اس منزل پر بھی حسینؑ کے سکون و اطمینان میں فرق نہ تھا، فرما رہے تھے پروردگارا یہ منزل بھی آسان ہے اس لیے کہ تو نظروں کے سامنے ہے۔

کربلا کے میدان میں دوستوں، عزیزوں، جگر کے ٹکڑوں کے لاشے اٹھانے کے بعد بھی بیکس سیدانیوں اور سہمے ہوئے بچوں کے پرہول مستقبل کو نظروں میں رکھنے کے باوجود بھی، سیکڑوں زخموں کے ہوتے ہوئے بھی جہادِ آخر میں حسینؑ کتنا مطمئن تھے اس کے لیے خود حسینؑ کے ایک دشمن کا بیان ہے:

''خدا کی قسم میں نے کربلا سے پہلے اور کربلا کے بعد کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اتنا مصیبت زدہ ہو، اتنا زخمی ہو، اتنا پیاسا ہو جتنا حسینؑ تھے اور پھر اتنا مطمئن ہو، اتنا پر سکون ہو جتنا مطمئن اور پر سکون حسینؑ جہادِ آخر کے وقت دکھائی دے رہے تھے۔''

جہادِ آخر ختم ہوا، شہادت کی منزل سامنے آئی، شمر خنجر بکف دکھائی دیا تو حسینؑ نے فرمائش کی نہ صرف یہ کہ مجھے اس معبود کی بارگاہ میں دو رکعت نماز شکرانہ ادا کر لینے دے جس کی یاد دل بسائی تو وہ قوت ملی، وہ طاقت برداشت ملی کہ پہاڑوں کو پگھلا دینے والے مصائب کے ہجوم میں نہ گھبرایا نہ تڑپا نہ مضطرب ہوا نہ دماغ معطل ہوا نہ فکر نے ساتھ چھوڑا۔ حسینؑ نے نماز شروع کی، سر سجدہ میں رکھا، قاتل پشت پر آیا، گردن پر خنجر رواں ہوا اور حسینؑ کے کانوں میں مشیت کا نغمہ گونج رہا تھا یَا اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْ اِلیٰ رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً۔ اے نفس مطمئن اپنے رب کی طرف کامیابی اور کامرانیوں کے ساتھ پلٹ آ تو مجھ سے خوش میں تجھ سے راضی۔



اسلام زندہ ہوگیا بس کربلا کے بعد

قائد ملت مولانا سید کلب جواد نقوی (امام جمعہ لکھنؤ)

جب سے انسانیت کی عمارے کی نیو پڑی اور ابوالبشر نے زمین پر قدم رکھا، شیطنت نے بھی زمین پر اپنے جال بچھانا شروع کر دیئے جس میں کمزور کردار کے بنی آدم پھنس گئے اور شیطان کے نمائندے بن کر حق کے نمائندوں کے مقابلہ پر آتے رہے بلکہ ان کا خون ناحق بہانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ انسانیت کی بقا کے لئے شیطنت کے مقابلے میں حق کے پرستاروں کو ہمیشہ اپنے خون کی قربانی دینا پڑی۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا ایثار جناب آدمؑ کا تھا جنھوں نے اپنے خون کی قربانی جناب ہابیلؑ کی صورت میں دی اور جناب ہابیلؑ نے بھی کردار کی انتہائی اعلیٰ مثال اس طرح پیش کی کہ جب قابیل خون بہانے پر تیار تھا تب بھی ہابیلؑ کی زبان پر یہی جملے تھے کہ بھائی چاہے تم مجھے قتل بھی کر ڈالو مگر میں تم پر ہاتھ نہ اٹھاؤں گا کیوں کہ تم میرے بھائی ہو۔ راہِ تبلیغ میں جناب نوحؑ نے اپنے خون کی قربانی اس طرح دی کہ لوگ تبلیغ کے جواب میں پتھر مارتے تھے اور جناب نوحؑ کا جسم زخموں سے لہولہان ہو جاتا تھا۔ لیکن جناب نوحؑ شیطانوں کو انسانیت کا درس دینے سے دست کش نہ ہوئے۔

باطل کے مقابلہ میں حق کے نمائندہ جناب ابراہیمؑ کو بھی عظیم قربانیاں پیش کرنا پڑیں۔ اسی طرح جناب یحییٰؑ اور جناب زکریاؑ کی خونچکاں داستانیں تاریخ سے چھپی نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ قربانیوں کا یہ سلسلہ جناب خاتم النبیین تک پہونچتا ہے اور اعلان ہوتا ہے کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو شیطانی مشینری پوری طاقت سے حرکت میں آجاتی ہے اور رسولؐ کو کہنا پڑا ''مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ قَطُّ کَمَا اُوْذِیْتُ'' جتنی اذیت مجھے دی گئی اتنی کسی کو نبی کو نہیں دی گئی۔ کبھی انسانیت کے مصلح اور اسلام کے پیغمبر کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے تو تلوے خون آلود ہوئے، کبھی اتنے پتھر مارے گئے کہ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ کوئی مددگار نہیں تھا سوائے ایک کمسن چچا زاد بھائی علیؑ کے جو ہر موقع پر سینہ سپر تھے۔ جنھوں نے کبھی مکہ میں بچوں کے پتھروں سے بچایا، کبھی شب ہجرت بستر رسولؐ پر سو کے حفاظت کی۔ کبھی بدر میں رسالت کے بدر کامل کا ہالہ اور کبھی احد میں شمع محمدی کا پروانہ بنے۔ رسولؐ اسلام نے انسانیت کی اصلاح کے لئے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جناب خدیجہ کی دولت کا ایک حبہ بھی اپنی اولاد کے لئے باقی نہ چھوڑا۔ پورا عرب زیر نگیں آ گیا تھا لیکن شہنشاہ دین و دنیا کو اپنے پیٹ پر پتھر تک باندھے دیکھا گیا۔ یہی ایثار و قربانی کا جذبہ خون بن کر علیؑ کی رگوں میں بھی دوڑ رہا تھا۔ اور رسولؐ فرما بھی چکے تھے کہ ''یَا عَلِیُّ علیہ السلام لَحْمُکَ لَحْمِیْ وَ

دَمُکَ دَمِیْ'' اے علیؑ تمہارا گوشت و پوست میرا گوشت و پوست ہے اور تمہارا خون میرا خون ہے۔ قربانی کا مفہوم ہے دوسرے کے نفس پر اپنے کو مقدم رکھنا۔

اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دینا اور ضرورت پڑنے پر اپنی انتہائی محبوب چیزوں کو دوسری کسی اہم چیز کے لئے قربان کر دینا۔ امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی پوری زندگی اس طرح کی قربانیوں سے عبارت ہے۔ قربانی اس وقت حقیقی معنوں میں قربانی ہو گی جب قربان کی جانے والی شے یا تو محبوب ہو بس اس کی سخت حاجت ہو۔ اسی لئے قرآن مجید میں ہے ''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ'' تم ہرگز نیکی تک نہیں پہونچ سکتے جب تک وہ چیز راہ خدا میں نہ دو جس سے تم محبت کرتے ہو۔ جس قدر محبت اور خواہش کی حد بلند ہوگی اسی قدر قربانی کا مرتبہ بلند ہوگا۔ اپنے نفس سے زیادہ اور کیا چیز کسی کو عزیز ہو سکتی ہے لیکن امیر المومنینؑ اس شان سے اپنے نفس کو راہِ خدا میں پیش کرتے ہیں کہ مرضیٔ پروردگار کے مالک بن جاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ قربانی کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ آخر میں اسلامی تعلیم کی تبلیغ اور اپنے بلند اصولوں کی خاطر علیؑ کو اپنی جان کی قربانی دینا پڑتی ہے اور مسجد کوفہ کی محراب علیؑ کے سر کے خون سے سرخ ہو جاتی ہے۔

حضرت علیؑ کے جانشین امام حسنؑ کی زندگی بھی ایثار و قربانی کا بہترین نمونہ ہے۔ یہاں تک کہ تخت حکومت کی قربانی دیدی تاکہ حق کے نمائندہ پر اقتدار پرستی کا الزام نہ آجائے۔ لیکن اس پر بھی باطل کے نمائندے اور شیطنت کے پرستار مطمئن نہ ہوئے اور آخر میں امام حسنؑ تھے زہر ہلاہل تھا، خون کی کُلّیاں تھیں اور طشت میں جگر کے ٹکڑے تھے۔

اب نمائندۂ حق امام حسینؑ تھے اور باطل کی نمائندگی یزید کر رہا تھا۔ حق کے نمائندہ سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا۔ بھلا امام حسینؑ ایک فاسق و فاجر و ننگ انسانیت کی بیعت اور اطاعت قبول کرتے۔ اب امام حسینؑ کے لئے موقع تھا کہ دنیا کو بتا دیں کہ دین کیا ہے اور بے دینی کیا ہے؟ انسانیت کیا ہے اور حیوانیت کیا ہے؟ ملک فتح کر لینا کیا ہے؟ اور دلوں پر فتح پانا کیا ہے؟ امام حسینؑ کو معلوم تھا کہ انسانیت کی بقا کے لئے اور اسلام کی حفاظت کے لئے عظیم قربانیاں دینا ہوں گی اور اس کے لئے وہ تیار ہو کر اٹھے تھے۔ اور وہ کیا تھا جو امام حسینؑ نے قربان نہیں کر دیا۔ یہ امام حسینؑ کی قربانیوں کا امتیاز ہے کہ ان کی کوئی مکمل فہرست مرتب نہیں کر سکتا۔ جتنی گہری نظر سے فہرست کیوں نہ بنائی جائے وہ نامکمل رہے گی۔ ازل سے راہ حق میں قربانیاں پیش کی جاتی رہی ہیں اور حق و باطل میں تصادم ناموں کے اختلاف کے ساتھ ہمیشہ سے جاری رہا ہے مگر امام حسینؑ کی قربانیوں کی یہ انفرادیت ہمیشہ باقی رہے گی کہ دیگر مثالوں میں آپ یہ بتا سکتے ہیں کیا کیا قربان کیا گیا مگر امام حسینؑ کے سلسلے میں تو یہ ڈھونڈنا ہے کہ کیا قربان نہیں کیا گیا۔ وطن چھوڑا، نانا کے مزار سے جدا ہوئے، ماں اور بھائی کی لحد چھوڑی، حج کو نامکمل ترک کرنا پڑا، سخت گرمی اور بلا کی دھوپ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ سفر کی تکلیفیں

اٹھائیں لیکن انسانیت کے اعلیٰ اقدار کو نہ چھوڑا۔ حُر کا لشکر خون کا پیاسا تھا لیکن اپنے ساتھ کا سارا پانی پلا کر سسکتی ہوئی انسانیت کو پھر سے زندہ کیا۔

کیا بتائیں کہ اسلام کے شجر کی آبیاری کے لئے اور جاں بلب انسانیت کو نئی زندگی دینے کے لئے امام حسینؑ نے کس کس کا خون دیا۔ اصحاب کا خون، عزیزوں کا خون، کڑیل جوان بیٹے علی اکبرؑ کا خون، برابر کے بھائی عباسؑ علمدار کا خون اور ایک خون اس زمین پر ایسا بہا جس کی نظیر تاریخ میں کبھی نظر نہ آئی وہ تھا ششماہے بچے علی اصغرؑ کا خون ناحق۔ مگر نہیں یہ خون زمین پر نہیں بہا اسے تو امام حسینؑ نے اپنے چہرے پر مل لیا گویا یہ روئے شہادت کا غازہ تھا۔

خود فرزند رسولؐ کا خون اس زمین پر مختلف طریقوں سے بہا۔ سینے کا خون، پہلو کا خون، چہرے کا خون، جبیں کا خون اور سب سے آخر میں قلب مبارک کا خون جس کے بعد امامؑ میں سنبھلنے کی طاقت نہیں رہی۔

تقریباً تیرہ سو برس قبل رسولؐ اسلام کے اس فرزند نے عقلوں کو حیران کر دینے والی وہ قربانی پیش کی تھی جس کے زلزلہ افگن مناظر، تحمل بشری سے بالاتر صبر و اطمینان، بے مثال دینداری، ہمت شکن مصائب، بے نظیر خدا شناسی اور مذہبی فدا کاری نے تمام عالم انسانی و ملکی اور تمام گروہ انبیاء و مرسلین کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔

کربلا میں سب افراد معصوم نہ تھے صرف امام حسینؑ یا چوتھے امامؑ اور پانچویں امامؑ کی شخصیتیں تھیں جو یقینی طور پر عصمت پوش تھیں۔ بنی ہاشم کے لئے بھی کہا جا سکتا ہے کہ آغوش عصمت کے پلے تھے مگر اصحاب پر نظر ڈالئے تو صرف شیعہ اور محب اہل بیتؑ تھے مگر انہوں نے بھی ایثار و قربانی کے ایسے بے نظیر مرقع پیش کئے کہ امام حسینؑ کو کہنا پڑا کہ مجھ سے زیادہ باوفا اصحاب کسی کو نہیں ملے۔ امام عصرؑ نے ارشاد فرمایا ''اے اصحاب حسینؑ میرے ماں باپ تم پر فدا ہو جائیں''

یقینا رسولؐ اور امیر المومنینؑ کو سلمانؓ و بوذرؓ مقدادؓ و قنبرؓ اور میثمؓ و مالک اشترؓ جیسے صحابی ملے مگر کوئی ایمان کے دس درجوں پر تو کوئی نو پر، کوئی آٹھ پر یعنی ایک ڈال موتی نہ تھے مگر کربلا ایک ایسا آئینہ خانہ تھا جس میں بہتر آئینوں میں صرف ایک تصویر تھی اور وہ تھی حضرت امام حسینؑ کی۔

طبیب روحانی امام حسینؑ کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اسلام ایک ایسے مریض کی مانند ہے جس کا دم لبوں پر ہو اور جس کی رگوں میں آلودہ خون دوڑ رہا تھا۔ ایسا مریض دو طرح سے ٹھیک ہو سکتا ہے یا موجودہ خون کو صاف کر دیا جائے یا نیا خون دیا جائے۔ حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور ابتدا میں امام حسینؑ کی یہی کوشش رہی کہ موجودہ خون کی ہی اصلاح ہو جائے لیکن جب یہ اصلاح ممکن نہ رہی تو امام حسینؑ نے فیصلہ کر لیا کہ اسلام کو زندہ رکھنے کے لئے اس کی رگوں میں نیا خون دوڑانا ہوگا۔ مریض کو وہی خون چڑھایا جا سکتا ہے جس کا بلڈ گروپ ایک ہو۔ کچھ مریضوں کا بلڈ گروپ کمیاب ہوتا ہے۔ امام حسینؑ نے عالم اسلام پر نظر ڈالی تو لاکھوں میں صرف بہتر نکلے۔

اس لئے راستہ میں ساتھ آئے لوگوں کو ہٹاتے گئے

اور صرف ان کو ساتھ رکھا جن کی رگوں میں تعلیمات اسلامی خون بن کر دوڑ رہی تھی اور انہیں کا خون اسلام کو حیات جاودانی عطا کرسکتا تھا۔ اگر امام حسینؑ اور اصحاب امام حسینؑ اسلام کے مردہ ہوتے ہوئے جسم میں اپنا خون نہ دیتے تو ظاہری اسلام تو ہوتا مگر روح اسلامی نہ ہوتی یعنی وہ اسلام رہ جاتا جس میں نماز تو ہوتی مگر اپنی بنائی ہوئی، روزہ تو ہوتا مگر خود پسند حدوں کے اندر، زکات ہوتی مگر تزکیۂ نفس نہ ہوتا خمس تو ہوتا مگر درِ پنجتن سے الگ ہٹ کر، حج ہوتا مگر تجارت کے لئے، جہاد ہوتا مگر حصول دنیا کے لئے۔ حلال محمدؐ حرام ہوتا ہے اور حرام محمدؐ حلال اور اسلام کی وہی صورت ہوتی جیسی کہ دشمن اسلام چاہتے تھے۔

☆☆☆

اتحاد کا اعلان کیجئے

حضرت نجم آفندی

ملت کے تفرقہ کا نہ سامان کیجئے
قرآن کے ورق نہ پریشان کیجئے

جاں دی تھی اتحاد کی خاطر حسینؑ نے
پورا شہیدِ ظلم کا ارمان کیجئے

سرکارِ دو جہاں کی محبت کے نام پر
آپس کے اختلاف کو قربان کیجئے

مرکز بنا کے آج حسینی نشان کو
دنیا میں اتحاد کا اعلان کیجئے

مدرسۂ نور ہدایت

حسینیۂ حضرت غفران مآبؒ میں بعد نماز مغربین عربی، فارسی، اردو اور دینیات کی تحصیل کے لئے اپنے بچوں کو ضرور بھیجیں۔

ادارہ

خطیب اعظم
خطیب منبر حسینی

علامہ عقیل الغروی صاحب قبلہ

خطابت: ایک مستقل صنف ادب ہے اور ''منبر'' ایک، مقام سخن، اور یہ کس قدر تاسف کی بات ہے کہ نہ اہل ادب میں شاعری اور نثر کے دوسرے مختلف اصناف کے مقابلہ میں خطابت پر کوئی خاص توجہ کی، نہ ہی عام طور پر سخنوروں نے ''فراز منبر'' کی صحیح شناخت کی اور دونوں گروہوں کی اکثریت۔ ''دار'' و ''فراز دار'' سے آگے نہ بڑھی حالانکہ، صلیب و دار کے استعارے اپنی حقیقتوں کے ساتھ کب کہنہ ہوئے بلکہ حلاج ناحق نعرۂ انا الحق سے جڑ کر ''سخن حق اور حق سخن'' کی راہ و روایت سے بیگانے ہوئے۔

خطابت واقعاً بجائے خود ایک مستقل صنف ادب ہی نہیں بلکہ ادبیات عالم میں موجود مختلف اسالیب اظہار میں سے ایک مخصوص اور منفرد اسلوب اظہار ہے۔ ایک ایسا اسلوب جو بیک وقت ''نثر'' سے کہیں زیادہ ''نثریت'' اور ''شعر'' سے کہیں زیادہ ''ارتکاز'' رکھتا ہے! اور یہ مخصوص اسلوب اظہار چاہے کسی سبب سے ادباء کی توجہ اپنی طرف زیادہ جلب نہ کر سکا ہو، لیکن کم بیش دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے اور اپنی ادبی اور فنی ماہیت کے اعتبار سے انتہائی دقیق بحث و بررسی کا مستحق ہے۔

''منبر'' وہ مقام سخن ہے جس کی اپنی ایک ذاتی صفت بلندی ہے اور وہ بھی ایک ایسی بلندی جس کو محض مکانی مفہوم میں تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہ بلندی ایک سیال معنوی حقیقت رکھتی ہے۔ یعنی یہ منبر کی اپنی ذاتی صفت ہونے کے باوجود اپنے اہل عناصر کی طرف منتقل بھی ہوتی ہے اور باتمام معنی منتقل ہوتی ہے یہ انتقال البتہ اہل عناصر کے درجۂ اہلبیتؑ کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

دنیا کی بے شمار مختلف زبانوں اور تہذیبوں میں عربی زبان اور ''ہاشمی ابراہیمی تہذیب'' نے خطابت و منبر کی تقریب سے انسانی ادبیات کو بالعموم اور اسلامی ادبیات کو بالخصوص خطات کی ایک اور خاص اور بسا بہتر و برتر صنف ''ذاکری'' سے روشناس کرایا۔ یہ وہ خطابت تھی۔ اور ہے جو منبر کی نشست اور ''وحی'' کی روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ ''عام خطابت'' کی بہ نسبت اس خاص خطابت کی اہمیت کا اندازہ اور تجزیہ اور بھی زیادہ سنجیدہ، عمیق اور وسیع مطالعہ کا مستحق ہے۔

یہ مختصر تقریب کلام خطابت، منبر یا ذاکری۔ ان میں سے کسی ایک سے متعلق بھی کسی فنی بحث و بررسی کی متحمل نہیں۔ یہ چند اشارات صرف خطیب منبر حسینی، خطیب آل محمدؐ، ملک الناطقین، فخر المتألهین شمس العلماء، مولانا سید سبط

حسن صاحب قبلہ جائسی ثم لکھنوی مرحوم ومغفور متخلص بہ، فاطر، کے ترجمۂ حیات کی تمہید کے طور پر پیش کئے گئے تا کہ قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ جب ابھی تک خطابت وذاکری کے اصناف پر کما حقہ کام نہیں ہو سکا تو ان اصناف میں اپنا لوہا منوانے والوں کی صلاحیتوں، محنتوں اور ان کی عظمتوں کا اندازہ کہاں تک کیا جاسکتا ہے ؟اور پھر اس شخص کی ''عبقریت'' کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے جسے دنیا نے ''خطیب آل محمدؐ'' اور ''خطیب اعظم'' کے القاب سے نوازا۔

خطابت و ذاکری کی فنی ماہیت اور اس کے مشکلات سے قطع نظر خطابت کی عملی دشواریوں کا اندازہ کرنے اور بطور خاص منبر کی اہلیت کی ایک ذراسی شناخت کے لئے عربی زبان کے چند مشہور علام کے بعض واقعات خطابت یا سانحات خطابت کا تذکرہ کافی ہوگا۔

جاحظ کی روایت ہے کہ عثمان منبر پر چڑھے (اور چڑھے کیا کہ آپ ہی اپنے چڑھنے کا سامنا کیا۔لرز گئے۔ یا یہ کہ انہیں بولنا مشکل ہو گیا۔تو بس اتنا کہہ کر اتر آئے کہ۔حقیقت یہ ہے کہ ابوبکر وعمر اس مقام ''منبر'' کے لئے مقامات یا تقریریں تیار کیا کرتے تھے اور تم لوگ تو ایک امام خطیب کی بہ نسبت ایک امام عادل کے زیادہ محتاج ہو۔ اور عنقریب تمہارے سامنے اپنے انداز کے خطبے پیش کئے جائیں گے (گویا پوری تیاری کے ساتھ) اور پھر تم لوگ جان جاؤ گے۔ (شاید اس آخری فقرے کا مطلب یہ ہو کہ پھر تم لوگ جان جاؤ گے کہ میں تیاری کے بعد کیسے خطبے سنا سکتا ہوں۔)

اسی طرح یعقوبی کا بیان ہے کہ جب ابوالعباس سفاح کی بیعت ہوئی اور اس نے خطبہ دینا چاہا تو خطبہ دینا اس کے لئے دشوار ہو گیا اور اس کے بدلے اس کے چچا داؤد بن علی نے خطبہ دیا۔ابن ابی الحدید نے داؤد بن علی کے بھی اس موقع کے خطبہ کو صرف اس قدر نقل کیا ہے کہ اس نے کہا لوگو! امیرالمومنین (کذا) تمہارے سامنے اپنے عمل سے پہلے اپنا قول پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتے اس لئے کہ عمل تمہارے اوپر خطبہ بیان کرنے سے زیادہ اثرانداز ہوگا۔اور تمہارے لئے کتاب خدا برائے علم کافی ہے اور رسولؐ خدا کے چچا کی اولاد تمہارے اوپر حکومت کے لئے کافی ہے۔

ان دونوں واقعات یا سانحات سے بھی شگفتہ تر واقعہ روح بن حاتم کا ہے، جسے ابوالحسن مدائنی نے نقل کیا ہے۔جب روح بن حاتم منبر پر گیا تو لوگوں نے دہشت اور تعجب کی نظر سے اسے گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا اور اس کی تقریر سننے کے لئے گوش برآواز ہو گئے۔تو روح بن حاتم نے کہا: لوگو! اپنے سروں کو نیوڑھا لو اور اپنی آنکھیں جھکالو اس لئے کہ منبر بڑی سخت سواری ہے۔(اب اس آخری فقرے پر کیا تبصرہ کیا جائے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ ''منبر ایک بڑی سخت سواری ہے۔۔۔'')

اس قسم کے واقعات دوسری زبانوں کی تاریخ خطابت میں بھی ضرور ہوں گے،لیکن عربی زبان کے حوالے صرف اس لئے پیش کئے گئے کہ دنیا کی دوسری قوموں اور زبانوں کی بہ نسبت عربی قوم ایک خاص صورت حال کی بنا پر

شاعری کے ساتھ ساتھ خطابت میں بھی تقریباً دوسری تمام قوموں پر فوقیت رکھتی ہے یہ خاص صورت حال کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا عربوں کی ایک امتیازی صفت اور نا قابل معذرت کمی اور کمزوری سے تشکیل پاتی ہے۔امتیازی صفت یہ کہ ''ناموس سخن'' سے بے حد کمال فطری مناسبت و وابستگی خصوصاً اس دور جو نزول قرآن سے شروع ہو کر اس کے ذرا بعد تک جاری رہتا ہے، جتنی عربوں کی نصیب میں آئی اتنی کسی دوسری قوم یا زبان والوں کے نصیب میں نہیں آئی۔دوسری طرف نا قابل معذرت کمی اور کمزوری اس قوم کے فن تحریر سے بالعموم ناواقفیت۔جو عین اسی دور میں نظر آتی ہے ان دونوں عوامل نے مل کر اس قوم کو اگر نثر نگاری کے میدان میں بہت پیچھے رکھا تو دوسری طرف شاعری اور خطابت کے میدان میں اس حد تک پہونچا دیا کہ دوسری قومیں اور دوسری زبان والے ان سے کہیں پیچھے رہ گئے۔آخر ''شعور سخن'' کی کسی نہ کسی صورت میں نمود تو ہونی ہی تھی۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے جس قوم کے فرد فرد میں شاعری اور خطابت فطری استعداد موجود تھیں اسی قوم میں ایسے سانحات خطابت اور پھر ایسے اعلام کے، کہ جن میں کچھ نہ سہی لیکن واقعاً ''جرأت رندانہ'' (ادبی اصطلاح میں شاید اس سے زیادہ کچھ نہ کہا جا سکے) تہور کی حد سے بھی سوا تھی، یہ اسی نکتہ کو پیش کرتے ہیں کہ خطابت کے فنی اور عملی عناصر، مسائل اور مشکلات واقعاً شاعری سے بھی پیچیدہ تر ہیں اور اس میدان کا مرد بننا چنداں آسان نہیں۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو ہندوستان کے گزشتہ مدرسۂ اجتہاد کے آخری ستون فقیہ اعظم مفتی احمد علی صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کا یہ قول صراحتاً مبالغہ ہونے کے باوجود کتنا واقعیت و حقیقت سے نزدیک معلوم ہوتا ہے کہ ''واقعہ تو یہ ہے کہ بنی آدم میں ایسا شخص پیدا نہیں ہوا'' اور ایسے شخص سے ان کی مراد تھی اسی شخصیت سے کہ جس برصغیر کے اسلامی مکتب فکر و مدرسۂ دانش و فرہنگ میں علی الاطلاق ''خطیب آل محمدؐ'' اور ''خطیب اعظم'' کے القاب سے جانا جاتا ہے۔یعنی شمس العلماء۔لسان المتألہین ملک الناطقین سید سبط حسن فاطر صاحب ''معراج الکلام''

حقیقت یہ ہے کہ جناب ''خطیب اعظم'' کی شخصیت ہند و سندھ کے اعلیٰ و ادبی افق پر ابھرنے والی وہ تحریر تھی جس کی علمی و فکری تہہ داری و تخلیقی و فنی پرکاری انتہائی عمیق اور وسیع مطالعہ و بررسی چاہتی ہے۔کاش! کوئی جیالا ان مغفور پر مستقل تحقیق کا بیڑا اٹھاتا اور لکھنؤ یونیورسٹی یا کسی بھی یونیورسٹی سے ان پر کوئی پی۔ایچ۔ڈی یا ڈیلٹ کا کام سامنے آتا۔

ان کا اصل وطن رئیس المتألہین سید الطائفہ آیۃ اللہ علی الاطلاق سید دلدار علی غفرانمآب طاب ثراہ صاحب ''عماد الاسلام'' کے وطن و مولد قصبہ نصیر آباد سے ملا ہوا قصبہ جائس (ضلع رائے بریلی) تھا اور ان دونوں بزرگوار کا جدی سلسلۂ نسب ایک ہی تھا (رحمھما اللہ) ان کے والد کا نام سید وارث حسین نقوی تھا۔۱۲۹۶ھ میں جائس میں ولادت ہوئی اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی کہ اہل خاندان اور اہل قصبہ بجائے خاصے بافضل تھے۔پھر

تکمیل علم کے لئے لکھنؤ کارخ کیا

فروغ طبع خدا داد اگرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسب فن کے لئے

کے بمصداق اس وقت کے فحول علماء آیۃ اللہ مؤسس نجم الملۃ والدّین سید نجم الحسن صاحب قبلہ الرضوی الامروہوی ثم الکھنوی۔اور فقیہ اہل بیتؑ مرجع کبیر آیۃ اللہ العظمیٰ سید باقر صاحب قبلہ اور اس وقت کے دیگر اساتذہ سے کسب فیض کیا اور خود اپنے اساتذہ کی نظر میں وہ مقام پیدا کیا کہ جب آیۃ اللہ مؤسس جناب نجم الملت صاحب طاب ثراہ نے ''مدرسۃ الواعظین'' کی تاسیس وتشکیل فرمائی تو انہیں اس کا صدر مدرس قرار دیا۔

اگرچہ بالآخر ان کی شہرت ان کی خطابت یا پھر شاعری اور دوسری ادبی حیثیتوں سے باقی رہی لیکن ان کے تعلیمی مرحلہ زندگی کے تذکرہ میں ایک واقعہ ایسا ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبع داری نے تعلیمی مرحلہ میں ہی فقہ واصول فقہ کے میدانوں میں بھی ایک خاص امتیاز عطا کر دیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ زمانہ لکھنؤ کے مدارس کا وہ تھا کہ جس میں آخری درجات یعنی ممتاز الافاضل وصدر الافاضل کے امتحانات کے پرچے اساتذۂ حوزہ علمیہ نجف بنا کر بھیجا کرتے تھے اور امتحانات کی کاپیاں بھی شبر واختبار کے لئے وہیں جایا کرتی تھیں ''خطیب آل محمدؐ'' کے مصنف کا بیان ہے کہ جب جناب سبط حسن صاحب قبلہ کے اصول وفقہ کی کاپیاں نجف پہونچیں تو وہاں ممتحن نے ان کے جوابات اپنی مجلس درس میں پڑھ کر سنائے اور اپنے شاگردوں کو ویسی استعداد پیدا کرنے کی ترغیب دلائی حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ معمولی نہیں۔

بطور خاص ان کی خطابت کے تعلق سے اس مختصر تقریب کلام میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ خطابت کے عام فنی عناصر اور علمی وعملی لوازم کے ساتھ بظاہر ان کے یہاں پانچ عناصر مستزاد تھے۔

۱۔عربی شعروادب کے وسیع مطالعہ سے تشکیل پانے والا ان کا خاص ذوق اور زاویۂ نظر جو آیات قرآن مجید اور ارشادات معصومینؑ کے ترجمہ وتجزیہ میں عام مترجمین و شارحین کی بہ نسبت کہیں زیادہ افادات پیش کرتا تھا۔

۲۔　اردو زبان پر ان کا خلاقانہ تصرف جو ان کے افادات کو خاص وعام ہر طبقہ کے ان کے سامعین کو ہر طرح مطمئن اور محظوظ کرتا تھا۔

۳۔　فلسفہ وکلام واصول فقہ کے اسالیب بحث پر ان کا تسلط جو ان کے افادات (یا نکتوں) کو علمی اور فکری معیار سے گرنے نہیں دیتا تھا۔

۴۔　مطالب کی ادائیگی میں الفاظ ومعنی کے بیشتر مناسبات کا لحاظ رکھتے ہوئے لہجے اور اشارات کے زیر وبم سے نامحسوس کو محسوس بنا دینے والا ان کا اپنا انداز خطابت۔

۵۔　اور سب سے اہم اور سب سے موثر عنصر ''منبر حسینیؑ'' کی عظمت کا احساس اور اس سے ان کا خلوص۔جیسے کسی بھی ''ذاکر'' کی کامیابی کی پہلی اور آخری شرط سمجھنا چاہئے۔

☆☆☆

اردو کا امّی مرثیہ گو

سید صادق علی نقوی ''چھنگا صاحب'' حسینؔ جائسی مرحوم

سید مصطفی حسین نقوی اسیفؔ جائسی

دادھیالی سلسلۂ نسب:۔

سید صادق علی حسینؔ بن میر حسن بن سید سجاد حسین (رئیسِ جائس) بن سید شیر علی بن سید مکرم علی بن سید محمد ولی بن سید حسین بن حبیب اللہ معروف بہ شیر علی بن عبد الجلیل بن سید شہاب الدین بن سید قاسم بن سید پیارہ حسینی بن سید سعد اللہ بن سید ماہرو بن سید شہاب الدین بن سید علی عرف سید بھیکہ بن سید جلال الدین بن سید عمر علی بن سید علیم الدین بن سید علم الدین بن اشرف الملک سید شرف الدین (حاکمِ جائس) بن نواب نجم الملک سید نجم الدین سبزواری (فاتح جائسی)۔

ننھیالی سلسلۂ نسب:۔

سید صادق علی حسینؔ بن باقری بیگم بنت صغریٰ بیگم بنت مولانا سید صادق صاحب بن سلطان العلماء آقا السید محمد بن حضرت سید دلدار علی غفرانمآبؒ۔

ولادت:۔

چھنگا صاحب حسینؔ ۱۲۹۱ھ کو اپنے نانا کے گھر سبزی منڈی لکھنؤ میں متولد ہوئے۔

تعلیم:۔

آپ بالکل انپڑھ تھے، نام تک نہ لکھ سکتے تھے۔ مجلس میں مرثیہ خوانی کے وقت کوئی مرثیہ الٹا سیدھا ہاتھ میں لے لیتے تھے اور محض اپنی زبردست قوتِ حافظہ کی مدد سے پڑھتے تھے۔ حسینؔ ان چند شعراء میں تھے جن کو قدرت نے شاعر پیدا کیا تھا۔

شاعری:۔

شاعری کی طرف آپ ۱۳۰۸ھ میں متوجہ ہوئے، آپ نے سب سے پہلے ایک نوحہ کہا پھر غزلیں کہنا شروع کیں پھر مرثیہ کہنے کا خیال پیدا ہوا تقریباً تیس سال مرثیہ گوئی کی۔ بچپن میں آپ کا قیام عراق میں تھا جس کے سبب سے آپ فارسی و عربی نہ صرف سمجھ لیتے تھے بلکہ بول بھی لیتے تھے۔

آپ کی شادی خانہ آبادی، نواب مولوی سید مہدی حسین ماہرؔ لکھنوی (بن سید علی حسین بن سید العلماء سید حسن علیین مکان بن حضرت غفرانمآبؒ) کی دختر نیک اختر سے ہوئی اور اس طرح ماہرؔ لکھنوی مرحوم آپ کے خسر اور سید محمد اصطفا صاحب خورشیدؔ لکھنوی آپ کے برادر نسبتی اور آپ لسان الشعراء سید مجاور حسین تمناؔ کے بڑے بھائی تھے۔ آپ کی خواہر عابدہ بیگم کی شادی ملک الشعراء سید بندہ کاظم جاویدؔ

لکھنوی (بن مولوی محمد جعفر امید لکھنوی بن منصف الدولہ شریف الملک مولانا سید محمد باقر بن سلطان العلماء بن غفرانمآبؒ) سے ہوئی۔ اس طرح چھنگا صاحب کے چاروں طرف علمی وادبی ماحول تھا جس میں ان کے فطری فن کو خوب ترقی کرنے کا موقع ہاتھ لگا۔

آپ کا ذریعۂ معاش کسی طرح کی محض ایک قلیل پینشن تھی۔ آخری عمر بڑی عسرت سے بسر کی لیکن خودداری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ آپ کا قیام پاٹے نالے پر تھا۔ مرتے وقت کثیر اولاد میں صرف دو بیٹیاں چھوڑیں۔

۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۴۰ء کو ساٹھ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی اور حسینیۂ غفرانمآبؒ کے صحن میں پیوند خاک ہوئے۔

حسینؔ صاحب جاوید لکھنوی کے شاگرد تھے۔ بحیثیت غزل گو حسینؔ کا شمار خوش گو شعراء میں تھا لیکن اصل میں وہ مرثیہ نگار تھے لہٰذا زیادہ زمانہ مرثیہ گوئی کے لئے وقف رہا۔ مرثیہ ہی وہ صنف ہے جس میں مرزا غالبؔ دہلوی مرحوم عاجز نظر آتے ہیں اور ان کے مرثیہ کے چند بند واسوخت بن کر رہ جاتے ہیں۔ جناب دولہا صاحب عروجؔ نے بھری مجلس میں حسینؔ صاحب کے متعلق فرمایا تھا کہ تم فخر ہندوستان ہو، اور اس میں ذرا شک وشبہہ نہیں کہ بحیثیت ایک امی مرثیہ گو کے وہ اردو اور ہندوستان کے لئے سرمایۂ افتخار تھے۔ چھنگا صاحب نے اردو کی طرح فارسی میں بھی شاعری کی ہے۔ مرحوم کے تقریباً چالیس مرثیے، غزلوں، سلاموں اور نوحوں کے مجموعے ساتھ ہی فارسی کلام بھی آپ کے برادر فردوسید مجاور حسین تمنؔا کے پاس محفوظ تھے جن کا اب حال نہیں معلوم۔

(تمنؔا بڑی خوبیوں کے مالک اور صاحب معلومات شاعر تھے ان کا صرف ایک شعر ملاحظہ فرما کر ان کی بلندئ فکر کے سلسلے میں فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ ؎

کیں سے تم کہیں پہونچو گے اشکوں کی روانی میں
تمنؔا گھر سے کیوں نکلے ہو اس آفت کے پانی میں)

مہذب لکھنوی صاحب ''اذکار محن'' میں ''حیات حسین'' کے ذیل میں تحریر کرتے ہیں۔ ''سید صادق علی عرف چھنگا صاحب حسینؔ مرحوم دیگر اصناف سخن میں بھی ماہر تھے لیکن مرثیے کی طرف ان کو خاص طور سے توجہ تھی۔''

حسینؔ مرحوم نہایت خوشگوار شاعر تھے مولوی بندہ کاظم صاحب جاویدؔ مرحوم ان کے بہنوئی تھے اور وہ انہیں سے اصلاح لیتے تھے۔ استاد کی شفقت اور اپنی طبیعت داری کی بدولت غزل اور مرثیہ دونوں میں مہارت حاصل ہوگئی، اختصار کے پیش نظر صرف ایک شعر غزل کا ملاحظہ ہو جس سے ان کے زور طبیعت کا اندازہ ہوجائے گا۔ ؎

کھینچا ہے جو ناوک تو سرک جاؤ ادھر سے
اب کون نہیں آگ نکلتی ہے جگر سے

غرض غزلیں بہت کہیں اور بہت خوب کہی ہیں لیکن مرثیہ غزل سے کہیں زیادہ مشکل چیز تھا مگر مرثیے بھی ایسے کہے کہ جب لوگ خود سنتے تھے تو بیحد محظوظ ہوتے تھے اور آج بھی ان کا مطالعہ تعجب ودلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

''اسرار محن'' میں مہذبؔ صاحب لکھتے ہیں کہ

''قدرت کا منظور نظر غیر معمولی انسان لکھنؤ کی سرزمین پر ایک ایسا باکمال گزرا ہے جس کا نام سید صادق علی عرف چھنگا تھا۔''

یہ بزرگ خاندان اجتہاد کی ایک فرد تھے مگر بالکل ان پڑھ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا دوسروں سے اپنا مرثیہ لکھواتے تھے اور منبروں پر دوسروں کی مدد سے پڑھتے تھے۔

''لکھنؤ کے امی شعراء'' میں حیدر حسین فضاؔ لکھتے ہیں کہ ''راقم الحروف'' کے استاد مرحوم و مغفور علامہ پرتوؔ لکھنوی نے تحریر فرمایا ہے کہ ''ایک وقت لکھنؤ کا یہ ماحول تھا کہ سید صادق علی عرف چھنگا صاحب حسینؔ لکھنوی حرف شناس بھی نہ تھے لیکن ذہن و حافظہ بلا کا پایا تھا حسنِ فکر کی نسبت سے حسینؔ اس پر جناب جاویدؔ لکھنوی کی اصلاح و تربیت نے حسن کلام بھی پیدا کر کے مکمل حسین بنا دیا۔ مرثیہ خود کہتے تھے اور لکھتا کوئی دوسرا تھا مجلس میں اپنا مرثیہ خود پڑھتے تھے میں خود ان کی مجلسوں میں شریک ہوا ہوں۔

حسینؔ منبر پر، مرثیہ ہاتھ میں، ایک شخص قریب منبر ایستادہ تھا اس نے شروع کا ایک لفظ چپکے سے بتایا اور حسینؔ اس سلسلے کے پورے بند ٹھاٹھ کے ساتھ پڑھ گئے، یوں ہی مرثیہ تمام ہوتا تھا۔ داد کا ہمہمہ بھی ہوتا تھا اور شور گریہ بھی۔ ان کے مرثیے کو دیکھکر کوئی یقین نہیں کرسکتا کہ یہ شخص قطعاً بے پڑھا تھا۔ نزاکت تخیل، شستگیٔ زبان، الفاظ کا استعمال برمحل، بندشوں میں روانی سبھی کچھ تو ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کلام ایک امی محض شاعر کا ہے۔

مہذبؔ صاحب فرماتے ہیں کہ ''جو کچھ کہا ایسا کہ بڑے بڑے خوشگویان کے دانت کھٹے کردیئے۔ اہلِ ذوق نے آج تک دنیا کی چیزیں دیکھی اور سنی ہوں گی مگر جاڑ انظماً نہ دیکھا ہوگا۔

پہلی ہستی ہے جس نے جاڑے کے متعلق ایسی بلند پروازی کی ہے اور وہ نازک خیالات جمع کئے جس کی داد کماحقہٗ نہیں دی جاسکتی۔

☆☆☆



نمونۂ کلام

ناظرین کرام امی شاعر کا زور بیان ملاحظہ فرمائیں

غزلیات

وقتِ زینت دور رکھا کر ستمگر آئینہ
حسنِ عالم سوز سے چٹکا ہے اکثر آئینہ

کھلا رہنے دو منھ میرا کفن سے کیوں چھپاتے ہو
سنا ہے وہ جنازے کے برابر ہوکے نکلیں گے

زخم کھولے ہیں اگر آنکھ تو بیزار نہ ہو
یہ نئی ضد کہ کوئی طالبِ دیدار نہ ہو

حال قیدی کا نہ ہو دیکھنے والا کوئی
آنکھ کھولے ہوئے گر روزنِ دیوار نہ ہو

کہتی ہے بلبل کہ دیکھئے کوئی حدّ شوقِ دید
شاخ پر کب ہے مرے تار نظر پر پھول ہے

میرے آنسو کی دو رنگی دیکھ کر کہتے ہیں وہ
آنکھ میں موتی ہے اور دامن میں گر کر پھول ہے

رباعی

منکر ہو جہاں میں اس کا کیوں کر کوئی
ڈھونڈے سے ملے نہ جس کا ہمسر کوئی

میزانِ خرد میں ہم نے تولا سو بار
لیکن نہ ملا نبیؐ سے بہتر کوئی

سلام

پڑے ہیں عرش کے ٹوٹے ستارے ضوفشاں ہوکر
زمینِ کربلا چمکے گی اب تو آسماں ہوکر

ہوائے تیغِ عباسؑ جری کا تیز دھارا ہے
پھریرے فوجِ اعدا کے اڑیں گے دھجیاں ہوکر

شبِ معراج ہے ہیں عاشق و معشوق میں باتیں
قیامت کر رہا ہے آج پردہ درمیاں ہوکر

کھلا بعدِ ولادت مرتضیٰؑ کے چشم و ابرو سے
یہی اک روز بت کعبے میں توڑیں گے جواں ہوکر

پیا ہے ناریوں کا خوں بڑھی ہے آب میں گرمی
ابھر آئے ہیں جوہر تیغ کے سب مچھلیاں ہوکر

گئے باغِ جناں میں ظہر تک جن جن کو جانا تھا
کھڑے ہیں شہ اکیلے یوسفِ بے کارواں ہوکر

چلے ہیں لے کے یہ کہتے ہوئے شبیرؑ خیمے سے　بعینہ مرتضیٰؑ ہوتے علی اصغرؑ جواں ہوکر
کہا شہ نے کہ اصغرؑ حجتِ ناطق کا پوتا ہے　سوال آب اعدا سے کرے گا بے زباں ہوکر
حسینؑ نقشِ قدم پر کاملوں کے پاؤں رکھتے ہو　چلے ہو پیچھے پیچھے تم بھی گردِ کارواں ہوکر

سلام

برا ہے حرص زر میں بندۂ اغیار ہوجانا　یہ کافی ہے غلامِ حیدر کرار ہوجانا
صراط اک پل ہے اے ایمان والو خوف کیا اس کا　علیؑ سے ناخدا کا نام لے کر پار ہوجانا
کہا بنت علیؑ نے دے کے رخصت دونوں بیٹوں کو　وغا میں تم علی تم جعفر طیار ہوجانا
لڑائی میں نصیحت عون کی تھی یہ محمد سے　جہاں گھرنا وہاں چلتی ہوئی تلوار ہو جانا
گلے پر تیر کھا کر مسکرائے مرحبا اصغرؑ　یہ سن اور یوں فدائے سید ابرار ہوجانا
نکیرین آچکے ہیں مرتضیٰؑ بھی آنے والے ہیں　ذرا قبر حسینؑ اب مطلعِ انوار ہوجانا

سلام

کمسنی میں کیا جری تھے زینبِ مضطر کے لال　ہاتھ سے تیغیں نہ چھوڑیں دم میں جب تک دم رہا
فاطمہؑ تھیں سب کے آگے بال بکھرائے ہوئے　تشنہ کاموں کا بپا کوثر پہ یوں ماتم رہا
کانپتے ہاتھوں سے ناوک کھینچ کر شاہِ ہدیٰ　دل سے لپٹائے رہے اصغرؑ میں جب تک دم رہا
کون کہتا ہے کہ لاشیں رن میں عریاں ہوگئیں　خوں کفن بن کر شہیدوں کے تنوں پر جم رہا

☆☆☆

روزِ عاشورہ کی گرمی کا تھا شب تک یہ اثر　خاک کے ذرے چراغِ قبر اصغرؑ ہوگئے
چشمِ عباسؑ جری سے جو گرے تھے بحر میں　اشکِ وہ بطن صدف میں جا کے گوہر ہوگئے

مرثیہ کے چند بند
جن میں شمشیرِ آبدار کی شرر باریاں دکھائی گئی ہیں

تیغیں کھینچنے لگیں ترکش سے نکلنے لگے تیر سپریں ہتواس کے تیار ہوئے سب بے پیر
نیزے اونچے ہوئے تادور بیاباں میں کثیر چمکے چار آئینے وہ صاف جو تھے برق نظیر
ہرطرف گردِ بیابان بلا اٹھی ہے
خوں کا مینہ برسے گا ڈھالوں کی گھٹا اٹھی ہے

یک بیک غل ہوا عباسؑ کی تلوار کھنچی میان سے تیغ پئے لشکرِ کفار کھنچی
روشنی ہو گئی جب صاعقہ کردار کھنچی دل لرزنے لگے وہ تیغِ شرربار کھنچی
فیصلہ کرنے کو اب بیچ میں کیوں ڈھال پڑے
اس کی جھنکار سے چار آئینوں میں بال پڑے

حسن حوروں میں کہاں یہ جو اسے حور کہوں خیرہ ہوتی ہے نظر پاس کہوں دور کہوں
ہوجو کاٹھی میں تو برقِ شبِ دیجور کہوں دل یہ کہتا ہے اسے شمعِ سرطور کہوں
بے خبر کو بھی تجلی کی خبر ہوتی ہے
خطِ ابیض ہواظاہر کہ سحر ہوتی ہے

جوہروں سے ہے یہ پیدا کہ ہے میناکاری اور قبضہ پہ جواہر کی سجاوٹ ساری
یا پری نکلی ہے پوشاک پہن کر بھاری روشنی اس کی ہو گر رات بھی ہو اندھیاری
یوں ہی آثارِ سحر ہوتے ہی اختر ڈوبے
جیسے آب دم شمشیر میں جوہر ڈوبے

تیغ آیت ہے تو ہیں اس کے معانی جوہر   آگ بنتے ہیں کبھی اور کبھی پانی جوہر
ہیں کہیں ہلکے گلابی کہیں دھانی جوہر   آب میں اپنی دکھاتے ہیں جوانی جوہر

خوبیاں جوہروں کی صاف نظر آئی ہیں
مچھلیاں تیغ کے پانی پہ ابھر آئی ہیں

موسم سرما کی تصویر کشی

فصل ایسی ہے کہ سردی کا زمانہ آخر   کہرا پڑنے سے نہیں دھوپ بھی ہوتی ظاہر
برف باری سے نشیمن میں ہیں پنہاں طائر   زمزمہ کرنے سے بلبل کی زباں ہے قاصر

دھیان آتا ہے تو بلبل کے جگر کانپتے ہیں
ایسی ٹھنڈی ہے ہوا جس سے شجر کانپتے ہیں

برف باری سے بیاباں کا ہے سبزہ پامال   پالا کھانے سے ہیں ٹھٹھرے ہوئے جنگل میں
اوس میں بھیگ کے شبنم کا برا ہے احوال   نہال پھل ہے جو باغ میں اس پہ بھی فالج کا خیال

گر بشر کھائیں ہوا واں کی تو ہوں تن نیلے
آج تک ہیں اسی دن سے لب سوسن نیلے

اوس پڑنے سے ہے بھیگی ہوئی صحرا کی زمیں   طائروں کو بھی برودت سے کہیں چین نہیں
انقلاب ایسا نہ آیا ہے تہہ چرخ بریں   بلبلیں بیٹھی ہیں لالے کی انگیٹھی کے قریں

بال و پر اوس سے بھیگے ہوں تو راحت کیسی
آتشِ گل میں برودت ہے حرارت کیسی

حکماء کو بھی ہے اب مہر کی حدت میں کلام
دھوپ بھی چاندنی کی طرح سے دیتی نہیں کام
بر د اطراف بیاباں کی زمیں کو ہے تمام
سر کھلے رہتے ہیں فواروں کو کیوں ہو نہ زکام

آب میں تھی جو روانی وہ تھمی جاتی ہے
دھار ہر ایک برودت سے جمی جاتی ہے

جام بلّور بعینہ ہوا ہر ایک حباب
مچھلیاں پانی کے جمنے سے پھنسی ہیں تہِ آب
ہیں شکنجے میں تو جنبش نہیں کھاتے گرداب
دانت بجتے ہیں گہر کے نہیں سردی کی جو تاب

جو حباب آب میں ہے غنچۂ سربستہ ہے
اس پہ کیا آج تلک آب گہر بستہ ہے

کیا بیاں کیجئے اللہ رے سردی کا اثر
وہی ٹھٹھرے ہوئے تھے جو کہ لب جو تھے شجر
ہے حبابوں کا یہ عالم کہ اٹھاتے نہیں سر
چادرِ آب میں لپٹے ہوئے بے حس ہیں مگر

پانی جم جانے سے موجہ تو کہاں اٹھتا ہے
منھ سے گرداب کے ہر بار دھواں اٹھتا ہے

برف اس حد کی گری ہے کہ وہ صحرا ہے سفید
کوہِ اسود تھا جو پہلے وہی سارا ہے سفید
منزلوں دیکھئے میدان میں سبزا ہے سفید
سنگِ مرمر کی طرح سامنے دریا ہے سفید

پانی جمنے سے سمندر میں کہاں جوش ہے آج
جو شجر بن میں ہے۔گویا وہ کفن پوش ہے آج



قرآن کا فلسفۂ تاریخ

آیۃ اللہ شہید السید باقر الصدرؒ
ترجمہ مولانا سید محمد ظفر حسینی صاحب

اس عنوان کے تحت بحث کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم جس موضوع کا انتخاب کر رہے ہیں وہ ہے ''قرآن کریم میں تاریخ کے اصول وضوابط''۔ اس سلسلے میں جو سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں، یوں ہیں: -کیا قرآن کریم میں بشری تاریخ کے کچھ اصول وضوابط پائے جاتے ہیں؟ -کیا تاریخ انسانی کچھ ایسے قوانین کی حامل ہے جو اسکے ارتقائی سفر پر حاکم ہوں؟ -وہ کون سے اصول وضوابط ہیں بشری تاریخ جن کی گرفت میں ہے؟ -تاریخ انسان کا آغاز کیونکر ہوا؟ -اس کی نشو ونما کس طرح ہوئی؟ -اس نے اپنا ارتقائی سفر کیسے طے کیا؟ -نظریۂ تاریخ کے بنیادی اسباب کیا ہے؟ -عملیۂ تاریخ میں انسان کا کیا کردار ہے؟ -عالم بشریت میں آسمان یا نبوت ورسالت کے کیا نقوش واثرات ہیں؟ -یہ وہ تمام سوالات ہیں جن سے مذکورہ بالا موضوع یعنی ''قرآن میں تاریخ کے اصول وضوابط'' اسی کے تحت ہمیں بحث کرنا ہے، اور یہ قرآن کا وہ رخ ہے جو مختلف زاویوں اور عنوانات سے سہی لیکن قرآن کریم کے بیشتر حصوں میں زیر بحث آیا ہے، مثال کے طور پر انبیاء علیہم السلام کے قصوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو اس قرآنی پہلو کے عظیم جزو کی نمائندگی کرتے ہیں، انبیاء کرام کے قصے تاریخی نقطۂ نظر سے زیر بحث آئے ہیں، جن سے مورخین نے مکمل استفادہ کیا ہے اور ان تمام واقعات وحوادث سے متعرض ہوئے ہیں۔ جنہیں قرآن کریم نے بیان کیا ہے اور جب انھوں نے کہیں پر کوئی ایسا خلا محسوس کیا ہے جسے قرآن نے پر نہیں کیا ہے تو انھوں نے اسے روایت و احادیث کے ذریعہ پر کرنے کی کوشش کی ہے یا جو کچھ گذشتہ مذاہب کی کتابوں میں نقل ہوا ہے اس سے خلا کو بھرنا چاہا ہے اور یا جھوٹی داستانوں اور خرافات کے ذریعہ اسے ختم کرنے کی سعی کی ہے جس کے نتیجہ میں اس قرآنی پہلو کے نظم وترتیب کی غرض سے تاریخ سے متعلق دفتر کے دفتر معرض وجود میں آگئے ہیں۔

اسی صورت قرآن میں اس پہلو پر ایک اور زاویہ یعنی قرآن کے اسلوب داستان نگاری کے نقطۂ نظر سے بھی بحث ہوئی ہے، نیز یہ کہ یہ قرآنی اسلوب حقیقت وواقعیت، قدرت بیان اور ندرت کلام کے جوہروں سے کس حد تک آراستہ ہے، قرآنی قصے حیاتی پہلوؤں اور تحرک بخش واقعات آفریں عناصر کی دولت سے کتنے زیادہ مالا مال ہیں؟ -یہ بھی چند ایسے گوشے ہیں جن پر گذشتہ موضوع کے تحت بحث ناگزیر ہے، نیز ان کے علاوہ بھی قابل بحث کچھ او

رموضوعات ہیں، لیکن ہم فی الحال مذکورہ عنوان کے تحت جس زاویہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ۔ ''اس گوشہ سے تاریخ کے اصول وضوابط پر اس حد تک روشنی پڑتی ہے'' تاریخ اصول وضوابط سے ہماری مراد وہ قوانین وحدود ہیں جو حرکت تاریخ میں مکمل طور پر کارفرما ہیں بشرطیکہ قرآن نے اس طرح کے اصول وضوابط اور قوانین وحدود کا کوئی تصور ہمیں عطا کیا ہو۔

دوسرے علوم وفنون کی مانند تاریخ کی دنیا میں بھی ہمیں کچھ موجودات وظواہر نظر آتے ہیں جس طرح فلکیات و طبیعات وغیرہ کے میدانوں میں کچھ ظواہر ملتے ہیں اسی صورت تاریخی میدان میں بھی۔ جس کی توضیح وتشریح مخصوص معنوں میں ہم عنقریب تاریخ ہی سے پیش کریں، موجودات وظواہر کی ایک تعداد نظر آتی ہے اور جس طرح دیگر میدانوں میں ان موجودات وظواہر کے لئے کچھ اصول وضوابط اور قوانین وحدود معین ہیں اسی صورت ہمیں یہ دریافت کرنے کا حق حاصل ہے کہ تاریخی میدان میں پائے جانے والے ظواہر بھی کچھ اصول وضوابط کے حامل ہیں یا نہیں؟ ان اصول وضوابط اور قوانین وحدود کے بارے میں قرآن کریم کا موقف کیا ہے؟ اور قرآن نے ان کے متعلق مثبت یا منفی انداز میں، مجمل یا مفصل طور پر کس نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے؟

بعض لوگ اس وہم کے شکار ہیں کہ ہمیں۔ یہ توقع وابسطہ نہیں کرنا چاہئے ''قرآن کریم میں تاریخ کے اصول و ضوابط جیسے موضوع پر کوئی بحث موجود ہوگی، کیوں کہ طبیعات، ایٹم اور نباتیات وغیرہ کے قواعد وضوابط کے مانند، تاریخ کے اصول وضوابط کا مسئلہ بھی ایک علمی مسئلہ ہے اور قرآن اکتشافات واختراعات کی کتاب کی حیثیت سے نازل نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت کتاب رشد وہدایت کی ہے۔ قرآن کسی درسی کتاب کی شکل میں نہیں آیا ہے اور رسول اللہ پر ایک معلم کے عنوان سے نہیں نازل ہوا ہے ان معنوں میں کہ جس طرح شاگرد کے لئے استاد کی باتیں لائق تقلید وعمل ہوتی ہیں، اسی صورت قرآن کا وجود بھی ایک استاد کا ہے، تا کہ وہ ماہر علوم اور متمدن وتہذیب یافتہ لوگوں کے ایک گروہ کا معلم ومربی ہو بلکہ یہ کتاب صرف اس لئے نازل ہوئی ہے کہ لوگوں کو گمراہی اور جاہلیت کے اندھیروں سے نکال کر رشد و ہدایت اور اسلام کے اجالوں میں لے آئے، لہٰذا اسے محض کتاب اصلاح وہدایت کہا جا سکتا ہے نہ یہ کہ اکتشافات واختراعات کی کتاب تصور کی جائے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہمیں قطعاً یہ امید نہیں رکھنا چاہئے کہ قرآن دیگر علوم وفنون سے متعلق کسی قسم کے حقائق و معارف اور ان کے بنیادی قواعد و ضوابط کے بارے میں کوئی نظریہ پیش کریگا۔ یا طبیعات، کیمیا اور نباتات وحیوانات وغیرہ جیسے موضوع پر کوئی بحث وتبصرہ کرے گا۔ البتہ ہمیں یہ تسلیم ہیکہ ان تمام علوم وفنون کی طرف قرآن میں اشارات ضرور موجود ہیں، لیکن یہ اشارات بس اسی حد تک ملتے ہیں جس حد تک قرآن کے ان ہی پہلو (اثبات الوہیت کے مسئلے) پر روشنی پڑ سکے اور اس الٰہی کتاب کا ربانی رخ سامنے آسکے۔ ایک ایسی کتاب۔ جو ماضی، حال اور مستقبل کے تمام حالات کا اپنے دامن میں

احاطہ کئے ہوئے ہے، جس کو گوناگوں علوم وفنون کے مختلف میدانوں میں، انسانی تجربیات و انکشافات پر علمی حقائق و معارف اور بے شمار رازہائے سربستہ کے چہروں سے نقاب کشائی کے سلسلے میں صدیوں کی سبقت و اولیت حاصل ہے، لیکن یہ قرآنی اشارات و کنایات ان ہی علمی اغراض و مقاصد کے تحت ہیں جن کا ابھی تذکرہ ہوا ہے نہ یہ کہ ان کا مقصد فزیکس اور کیمسٹری وغیرہ کی تعلیم دینا ہو۔ قرآن، انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کی جگہ خود نہیں لینا چاہتا ہے اور نہ اس کی خداداد لیاقتوں اور صلاحیتوں کو تلاش اور ریسرچ سے ذرا بھی باز رکھنا چاہتا ہے۔ خواہ وہ زندگی کے شعبوں میں سے کسی بھی شعبۂ حیات میں تلاش اور ریسرچ کا مسئلہ ہو، جس کا ایک جز و تجربیات و مشاہدات اور موجودات سے آشنائی بھی ہے، چنانچہ قرآن نے کبھی بھی ان امور کی جگہ خود نہیں لینا چاہی، بلکہ خود کو ایک ایسی روحانی اور معنوی طاقت کے عنوان سے پیش کیا ہے جس کا کام انسان کی ہدایت و رہنمائی، اس کی خوابیدہ طاقتوں کو بروئے کار لانا، زندگی کے سچے راستے پر اسے گامزن کرنا اور ولولہ و تحرک عطا کرنا ہے۔

غرض کہ یہ بات جب تسلیم شدہ ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کا فریضہ لوگوں کی ہدایت و رہنمائی ہے اور وہ اکتشافات و اختراعات کی کتاب نہیں ہے تو اب ہمارے لئے اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے کہ ہم یہ بے جا توقع رکھیں کہ قرآن ان تمام علوم وفنون سے متعرض ہو جن کے اصول وضوابط کی تعیین وحد بندی اور قوانین وحدود طے کرنا انسانی فہم و دماغ کا کام ہے۔ ہم کیوں بلا وجہ منتظر رہیں کہ قرآن علوم وفنون کے بنیادی اصول کی نشاندہی کرے گا اور اس سلسلے میں اپنے نظریات بیان کرے گا؟ یا کائنات کے بے شمار شعبوں اور میدانوں میں سے صرف شعبۂ تاریخ میں اس کے اصول وضوابط سے متعلق کوئی علمی مفہوم ہمارے سامنے پیش کرے گا؟ جبکہ دیگر شعبوں میں قرآن نے اس طرح کی کوئی روش نہیں اپنائی ہے، اور اس سلسلے میں قرآن پر کوئی اعتراض بھی وارد نہیں ہوسکتا کہ وہ دیگر میدانوں میں اس قسم کے رویہ کا حامل کیوں نہیں ہے؟ کیونکہ اگر ان اصول وضوابط اور قواعد وقوانین کی نشاندہی اور حقائق و معارف کی نقاب کشائی کی ذمہ داری قرآن کے دوش پر ہوئی تو اس کتاب کی نوعیت بھی کچھ اور ہی ہوتی۔ پھر یہ پوری دنیائے بشریت کے فائدے اور مقصد کی کتاب نہ رہ جاتا بلکہ علوم وفنون کے ماہر طبقہ کی مخصوص کتاب ہوجاتی جسے ایک درسی اور نصاب کی کتاب کے عنوان سے مخصوص گروہوں، شعبوں اور حلقوں میں پڑھا جاتا۔

ہمارے اختیار کردہ موضوع سے متعلق بعض افراد کے یہ چند اعتراضات ہیں اور باوجودیکہ کسی حد تک یہ اعتراضات بجا اور درست ہیں یعنی قرآن اکتشافات و اختراعات کی کتاب نہیں ہے، وہ انسان کی ارتقائی طاقتوں، ایجاد واختراع کی قوتوں اور تلاش اور ریسرچ کی صلاحیتوں کو زنگ آلود نہیں بنانا چاہتا ہے، بلکہ وہ رشد وہدایت کی کتاب ہے، اس کے باوجود ہمیں تاریخ اور دنیا کے دیگر علوم وفنون کے درمیان ایک بنیادی فرق نظر آتا ہے اور یہی وہ بنیادی

فرق ہے جو تاریخ پر حاکم اصول وضوابط سے ایک ایسا مسئلہ وجود میں لاتا ہے جسے علوم کے دیگر شعبوں اور بشری معارف کے دیگر میدانوں کے برخلاف قرآنی فریضہ سے بے حد گہرا ربط اور زبردست لگاؤ ہے۔(یعنی ہدایت ہی کی طرح وہ بھی قرآن کی اہم ترین ذمہ داری ہے)اور وہ یہ ہے کہ قرآن کتاب ہدایت ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاح بشری اور تغییر باطن کی کتاب بھی ہے،اور''تغییر باطن'' یہ قرآن کی وہی ذمہ داری ہے جس کو خود اس نے ''ظلمت سے نکال کر نور میں لانے'' سے تعبیر کیا ہے ''يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ'' ''تغییر باطن'' کا عمل دوہرے پہلوؤں کا حامل ہے۔اس کا اولین پہلو اس کے مضمون اور مطالب ومفاہیم کا ہے،جن کی بازگشت احکام الٰہی ،ضوابط حیات اور قوانین زندگی کی جانب ہوتی ہے اور جنہیں ہم تشریعی امور کا نام دیتے ہیں۔عمل تغییر کا یہ الٰہی ،ربانی اور آسمانی پہلو ہے،یہی پہلو اس شریعت الٰہیہ کی نمائندگی کرتا ہے جو نبی اکرمؐ پر نازل ہوئی اور جس کا نزول ہوتے ہی تمام تاریخیوں میں اس کا چرچا ہوا،کیونکہ یہ شریعت اس ماحول کی وسعت سے جس میں نازل ہوئی تھی کہیں زیادہ بڑی اور اس فرد کے دائرۂ وجود سے جس کو اس کی تبلیغ و رسالت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی،کہیں زیادہ وسیع تھی۔چنانچہ عمل تغییر کے اس پہلو کو مضمون اور مطالب ومفاہیم کے پہلو کا نام دیا جاسکتا ہے،نیز اسے تشریعی احکام اور ایسے قواعد وقوانین کے نام سے بھی یاد کرسکتے ہیں،عمل تغییر جن کی پابندی ہم پر لازم قرار دیتا ہے اور یہی اس کا الٰہی وربانی پہلو بھی ہے۔اس کے علاوہ عمل تغییر ایک اور پہلو کا حامل ہے جو نبی اکرمؐ اور اصحاب کرام کے ذریعہ بروئے کار آیا ہے،چنانچہ ہم جب اسے ایک ایسے عمل کی شکل میں جو لوگوں کے ایک گروہ یعنی پیغمبر اکرمؐ اور اصحاب کرام کی ذوات مقدسہ میں مجسمہ ہوکر سامنے آیا ہے۔ملاحظہ کرتے ہیں۔اور اسے ان افراد میں مجسم ایک اجتماعی عمل کے روپ میں دیکھتے ہیں۔نیز یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مختلف حالات و واقعات کے موڑ سے گذرا ہے اور جس نے متعدد اعتقادی،معاشرتی، سیاسی اور فوجی میدانوں میں اجتماعی بحث ونزاع کے مختلف مراحل سر کئے ہیں،(اسی صورت)جب ہم تغییر کے اس عمل کا اس حیثیت سے جائزہ لیتے ہیں کہ یہ عرصۂ تاریخ میں واقع ایک ایسا مجسم بشری کردار ہے جس کا(تاریخی دنیا کے علاوہ) دوسرے گروہوں اور دیگر حالات و واقعات سے بھی ایک ایسا تعلق،ربط اور لگاؤ ہے جو اس کی تائید وتردید دونوں کا مستحق بن سکتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب عمل تغیر نقطۂ نظر سے ہم مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ انسانی جنبہ کے حامل ایک بشری کردار کی شکل میں سامنے آتا ہے اور یہ وہ افراد ہیں جن پر دوسرے لوگوں کی مانند تاریخی اصول وضوابط بہت زیادہ حد تک حکم فرما ہوتے ہیں بالکل اسی صورت سے کہ جیسے دیگر طبقات اور گروہوں پر ان کی فرماں روائی ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ عملی تغییر اس کدکاوش کا نام ہے جو قرآن کریم اور پیغمبرؐ اکرم کی جانفشانیوں کا ثمرہ ،جس کے دو پہلو ہیں۔ایک قانون و شریعت اور دوسرا وحی والہام،چنانچہ وہ ایک الٰہی وربانی عمل

اور بشری تاریخ کی سطح سے کہیں زیادہ بلند اور مافوق ہے لیکن اس اعتبار سے کہ وہ ایک ایسا عمل ہے جسے تاریخ انسانیت کے میدان میں انجام دیا جارہا ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ ایک ایسی بشری سعی و کوشش کا نام ہے جس کا براہ راست دوسری بشری کاوشوں اور کوششوں سے مقابلہ اور ٹکر ہے۔

بہرحال اسے ایک ایسا تاریخی عمل تسلیم کرنا ہوگا جس پر تاریخی اصول وضوابط بہر صورت حاکم ہوں گے، چنانچہ خداوند عالم نے موجودات عالم کے نظم وضبط کی خاطر تاریخ کی دنیا میں جو قواعد وقوانین وضع فرمائے ہیں وہ اس پر حکم فرما ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ جب قرآن عمل تغییر کے اسی دوسرے پہلو یعنی بشری وانسانی جنبہ کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو اس کا محور محض ذات بشر ہوتی ہے آسمانی پیغام اور وحی والہام کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ انسان کے صرف بشری جنبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے گفتگو کرتا ہے اور ان انسانوں کا تذکرہ کرتا ہے جہاں وہ تمام تاریخی اصول وضوابط حکم فرما ہوتے ہیں جو دوسرے افراد کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں مثال کے طور پر ہمیں یہ ملے گا کہ جب قرآن نے جنگ احد میں مسلمانوں کی فتح وکامیابی کے مسئلہ پر روشنی ڈالنا چاہی،

درصورتیکہ وہ جنگ بدر میں عظیم الشان نمایاں کامیابی حاصل کر چکے تھے لیکن اس کے بعد انہیں جنگ احد میں کافی نقصانات اٹھانے پڑے اور ابتدا میں شکست کا سامنا کرنا پڑا، تو جب قرآن نے اس نقصان اور شکست کا تذکرہ کیا تو کن الفاظ میں کیا؟۔ کیا یہ کہا کہ سماوی پیغام اور نبوت ورسالت کو نقصان اور شکست کا سامنا کرنا پڑا؟ نہیں یہ ہرگز نہیں کہا!۔۔۔ کیونکہ وحی الٰہی اور نبوت ورسالت کا مرتبہ دنیاوی معیاروں کے مطابق وضع کئے گئے فتح وشکست کے مفاہیم سے کہیں زیادہ برتر اور بلند ہے۔ الٰہی پیغام اور نبوت ورسالت کبھی شکست خوردہ ہوئے ہیں اور نہ کبھی شکست کھا سکتے ہیں، ہاں جسے شکست کا منھ دیکھنا پڑتا ہے وہ صرف انسان ہے خواہ یہ وہی انسان کیوں نہ ہو جس کو الٰہی پیغام کی تبلیغ ورسالت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان بہرحال تاریخی اصول وضوابط کی گرفت میں ہوتا ہے، چنانچہ ہمیں اس سلسلے میں قرآن کا ارشاد یوں ملے گا ''وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ'' (آل عمران ۱۴۰) یعنی یہ (فتح وشکست کے) وہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کو یکے بعد دیگرے دکھاتے رہتے ہیں۔ یہاں پر قرآن نے انسانوں کا ذکر بحیثیت انسان کے کیا ہے، چنانچہ مقصود قرآنی یہ ہے کہ اس واقعہ کا ربط دراصل تاریخی اصول وضوابط سے ہے مسلمانوں کو جنگ بدر میں ایسی صورت حال میں کامیابی نصیب ہوئی جب تاریخی اصول وضوابط کے مطابق اس وقت کے موجودہ حالات فتح وکامیابی کے متقاضی تھے اور معرکۂ احد میں انہیں شکست کا منھ دیکھنا پڑا جب تاریخ کی رو سے اس وقت کی صورت حال شکست و ہزیمت کی متقاضی تھی ''اِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ الخ۔۔۔'' (آل عمران ۱۴۰) یعنی اگر تمہیں شکست اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑا ہے تو تمہارے دشمنوں پر بھی یہ افتاد پڑے گی، ہم نے فتح وشکست کے دنوں کو باری باری

سب کے لئے قرار دیا ہے۔ قرآن کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم یہ تصور ہرگز نہ کرنا کہ فتح وکامیابی اللہ کا عطا کردہ تمہارا ذاتی حق ہے بلکہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ نصرت وکامیابی تمہارا فطری حق ہے، بشرطیکہ تم نے ان تاریخی اصول وقوانین کی روشنی میں اس کے اسباب ومقدمات خود فراہم کئے ہوں، جو حصول کامیابی کے لئے خداوند عالم کی جانب سے معین کئے گئے ہیں، چنانچہ جنگ احد میں تمہاری ناکامی کا یہی سبب ہوا، چونکہ تمہارے حالات فتح کے متقاضی نہیں تھے اس لئے شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ غرض کہ یہاں پر قرآن کا روئے سخن بشر کی طرف بعنوان بشر ہے۔ اس کی گفتگو کا محور بشری اعمال وافعال ہیں، یہاں پیغام سماوی اور منصب نبوت ورسالت سے کوئی بحث نہیں ہے اور صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں بلکہ قرآن اس مرحلہ میں اور بھی آگے گیا ہے اور اس نے پردۂ تاریخ پر نقل وحرکت کرنے والی نہایت پاکیزہ وپارسا مخلوق یعنی دنیائے بشریت کو دھمکی تک دی ہے، چنانچہ خطاب کرکے کہا ہے کہ اگر تم اپنا تاریخی کردار صحیح معنوں میں ادا نہ کروگے اور خود کو اس بات کا اہل نہ بناؤ گے کہ الٰہی پیغام کی تبلیغی ذمہ داری اور منصب رسالت کا بار سنبھال سکو تو اس کا قطعاً یہ مطلب نہ ہوگا کہ وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع اور پیغمبری کا کام بند کردیا جائے اور تاریخی اصول وقوانین نافذ نہ کئے جائیں، ایسا ہرگز نہ ہوگا، تم اگر اپنا فریضہ ادا نہ کروگے تو تمہاری جگہ پر دوسروں کو لایا جائے گا تاریخ تمہیں اپنے منصب سے معزول کرکے تمہارے بدلے یہ ذمہ داری دوسری امتوں کے حوالے کردے گی، جو تمہارے مقابلہ میں تم سے کہیں زیادہ بہتر اسباب وحالات فراہم کرنے کی اہل ہوں گی اور تم سے کہیں زیادہ بہتر انداز میں اپنے فرائض وکردار ادا کرسکیں گی، اور صرف یہی نہیں بلکہ ایسی صورت حال میں جب حالات اس امر کے متقاضی نہ ہوں گے کہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو تو پھر وہ امتیں تم پر اور تمام لوگوں پر گواہ قرار دی جائیں گی چنانچہ اس مطلب کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ''اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ۔۔۔الخ'' (توبہ ۳۹) یعنی اگر تم نے خود کو جہاد کے لئے آمادہ نہ کیا تو دردناک عذاب میں مبتلا ہوگے، اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لائے گا تم اسے کسی طرح کا نقصان نہیں پہونچا سکتے ہو وہ ہر امر پر قادر ہے۔ دوسری جگہ یوں ارشاد ہے

''یَاَاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا مَنْ یَرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ۔۔۔الخ'' (مائدہ ۵۴) یعنی اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی بھی اپنے دین سے منحرف اور مرتد ہوا تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض ایسے لوگوں کو وجود میں لائے گا جنہیں وہ خود دوست رکھتا ہوگا اور وہ بھی اسے دوست رکھتے ہوں گے، جو مومنین سے انکسار وخاکساری کے ساتھ پیش آئیں گے کافروں سے شدت وسختی کا سلوک روا رکھیں گے راہ خدا میں جہاد کریں گے اور انہیں ملامت کرنے والوں کی ملامت کا کوئی خوف وہراس نہ ہوگا۔ یہ خدا کا لطف وکرم ہے وہ جسے چاہے نوازتا ہے اور وہ صاحب وسعت اور علیم ودانا ہے۔

معلوم ہوا کہ ان جگہوں پر قرآن کا موضوع بحث عمل تغییر کا دوسرا رخ بشری پہلو ہے اور انسان سے اس کی گفتگو اس کی کمزوری وناتوانی، استقامت وپامردی، انحراف وگمراہی

اور حالات کی فراہمی و عدم فراہمی اور سازگاری و ناسازگاری کے بارے میں ہے۔

چنانچہ یہ بات یہیں سے ثابت ہوجاتی ہے کہ تاریخ اور تاریخی اصول وضوابط کے موضوع کا قرآن جیسی الٰہی کتاب سے جو اگرچہ رشد و ہدایت کی کتاب ہے اور لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور میں لانے کے لئے نازل ہوئی ہے، بے حد گہرا ربط اور اعضائے جسمانی کا سا شدید تعلق ہے، کیونکہ عمل تغییر کے عملی رخ یا یوں کہا جائے کہ اس کے بشری پہلو کا سر تسلیم ہمیشہ تاریخ کے قواعد وقوانین کے سامنے خم اور سدا تاریخ کے زیر اثر ہے، لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس سے مکمل استفادہ کریں اور قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہمیں ایسے نظریات و تصورات عطا کرے جن سے فلسفۂ تاریخ اور تاریخی اصول وضوابط کے موضوع پر اسلام و قرآن کے بنیادی افکار و نظریات ایک ڈھانچہ سامنے آسکے۔

اس بیان سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہوجاتی ہیکہ فلسفۂ تاریخ کی نوعیت فزکس، کیمسٹری اور علوم فلکیات و حیوانیات و نباتیات وغیرہ کی سی نہیں ہے، کیونکہ ان علوم اور ان کے اصول وضوابط کا تاریخ سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہے، لیکن اس کے برعکس تاریخ اور تاریخی اصول وضوابط کا براہ راست رابطہ عمل تغییر سے ہے، اسی لئے جب بھی عمل تغییر کا دوسرا رخ زیر بحث آئے تو ضروری ہے کہ فلسفۂ تاریخ اور تاریخی اصول وضوابط کی بھی توضیح وتشریح کی جائے اور اس سلسلے میں ہمیں قرآن سے پوری توقع رکھنا چاہئے کہ وہ ہمیں اس موضوع سے متعلق بنیادی قواعد و قوانین سے آگاہ کرے البتہ ہماری یہ توقعات قطعاً بے جا ہوں گی کہ قرآن علم تاریخ اور اس کے قواعد وضوابط کی ایک درسی کتاب کا کردار ادا کرے یعنی اس کے دامن میں تاریخ سے متعلق تمام تفصیلات و جزئیات موجود ہوں حتیٰ کہ اس میں وہ تمام باتیں بھی بیان کی گئی ہوں جن کا تغییر کے اس عمل سے جسے نبی اکرمؐ کی ذات گرامی نے انجام دیا ہے۔ دور کا بھی واسطہ نہ ہو، کیونکہ قرآن بنیادی طور پر رشد وہدایت کی کتاب ہے، اس نے کسی بھی مقام پر اپنے اس وصف و امتیاز کو کھویا نہیں ہے، وہ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لانے والی کتاب ہے چنانچہ ہر منزل میں وہ اپنی اس حقیقی شان اور ذاتی خصوصیت کا محافظ رہا ہے۔ اس نے تاریخ وفلسفۂ تاریخ کے موضوع پر جو کچھ بھی بحث کی ہے انہیں حدود میں باقی رہتے ہوئے کی ہے اور تاریخ کے قواعد وقوانین کے متعلق منھ شگافیاں بھی بس اسی حد تک کی ہیں جس حد تک عمل تغییر کے پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے اور وہ بھی بس اسی دائرہ میں رہتے ہوئے جس دائرہ میں رہ کر نبی اکرمؐ نے اس کو انجام دیا ہے اور جس حد تک تاریخ وقوانین تاریخ کی جانب بشر کی رہنمائی ہوتی ہے اور وہ رونما ہونے والے واقعات و حادثات اور سامنے آنے والے حالات وکیفیات نیز زندگی کی صورت حال کے بارے میں صحیح رائے اور سچا نظریہ قائم کر سکنے کے قابل ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کے ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ تاریخ کے بھی کچھ اصول وضوابط

ہیں، جس طرح دیگر دنیاوی علوم وفنون کچھ قواعد وقوانین کے حامل ہوتے ہیں اسی صورت تاریخ کی دنیا میں بھی اس کے کچھ قواعد وضوابط معین ہیں، قرآن کریم میں یہ حقیقت نہایت واضح اور آشکار ہے، متعدد آیتوں میں مختلف عنوانات سے مختلف اسلوب اور انداز میں اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ انتہائی واضح طور پر اس بنیادی مفہوم کو جگہ جگہ بیان کیا گیا ہیکہ قرآنی نظریہ کے تحت بھی تاریخ کے کچھ اصول ہیں اور اس کے کچھ قواعد وقوانین معین ہیں۔

بعض دوسری آیتوں میں ان قوانین کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جو انسان کے سفر تاریخ پر حکم فرما ہیں نیز ان کی مثالیں، نمونے اور مصادیق بھی بیان کر دیئے گئے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے مقام پر اس نظریہ یعنی فلسفۂ تاریخ کے بنیادی مفہوم کو اس کے مصادیق اور عملی نمونوں کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ بعض دیگر آیات میں تو گذشتہ حالات و واقعات سے سبق اور نصیحت حاصل کرنے کی بے حد تاکید کی گئی ہے اور تاریخ بشریت کی چھان بین اور اس کی گہری تحقیقات پر انسانی ہمت کو بھرپور ابھارا گیا ہے۔

جیسا کہ سبھی سمجھتے ہیں کہ پیش آنے والے واقعات وحادثات کی تحقیق ودریافت اور چھان بین کا کام بذات خود ایک علمی کام ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخی اصول وضوابط کا گہرا جائزہ لیا جائے اور اس کے قواعد و قوانین کا باقاعدہ تجزیہ کیا جائے ورنہ بغیر کسی قاعدے قانون کے تحقیق وتجزیہ اور چھان بین کا کوئی مفہوم نہیں۔

غرض کہ قرآن کریم نے مختلف آیتوں میں متعدد لب ولہجہ میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے اور تاریخ کے اصول وضوابط کے موضوع پر سیر حاصل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

☆☆☆



سلام

خطیبِ اعظم علامہ سید سبط حسن نقوی فاطر جائسی

دیں کو بے دینوں نے مطعونِ زمانہ کردیا　　مصطفیٰؐ کی آل پر بند آب و دانہ کردیا
گردن و سر کی بلائیں ماں نے لیں وقتِ وداع　　ان جھنڈولے بالوں میں اصغرؑ کے شانہ کردیا
مختصر سی بات تھی اک قطرہ پانی کا سوال　　موت نے اصغرؑ کی اس کو اک فسانہ کردیا
خاندانِ مصطفیٰؐ کا مارنا مقصود تھا　　ظالموں نے ترکِ بیعت کا بہانہ کردیا
اک زمیں ہوتی زمینِ نینوا بھی دہر میں　　شاہ نے اس کو جناں کا آستانہ کر دیا
پردہ داروں کو میانِ خاک و خوں رہنے دیا　　عورتوں کو شام کی جانب روانہ کر دیا
ہر قدم پر جس کو غش آتا تھا راہِ شام میں　　اے فلک اس کو سپردِ تازیانہ کر دیا
دھوپ میں سیدانیاں کیا دیکھتیں لاشِ حسینؑ　　کھول کر بالوں کو پیدا شامیانہ کر دیا
اصل میں مقصود تھی بے پردگیٔ آلِ پاک　　چادروں کے چھیننے کا اک بہانہ کر دیا
کیوں نہ کھنچ آئے زبانِ تیرِ ظالم راہ میں　　حُرملہ نے حلقِ اصغرؑ کو نشانہ کردیا
اے فلک کب تک رہیں زنداں میں آلِ مصطفیٰؐ　　قید ہی میں ختم چہلم کا زمانہ کر دیا
جانتا تھا راہِ جنت اس لئے شبیرؑ نے　　اپنے آگے قافلہ اپنا روانہ کر دیا
حضرتِ عباسؑ نے دیکھی جو تیروں کی بلا　　صدقۂ مشکِ سکینہؑ اپنا شانہ کر دیا

(۲)

ہوا زمیں پہ کہ بالائے آسماں نہ ہوا　　علیؑ کے لال کا ماتم کہاں کہاں نہ ہوا
سبھی فرات سے آآکے پی گئے پانی　　مگر حسینؑ سا کوئی بھی میہماں نہ ہوا
تمام ہو گئے لے لے کے کروٹیں اکبرؑ　　یہ رنج ہے کہ کوئی دردِ دل بیاں نہ ہوا
وہ داغِ مرگِ پسر تھا کہ شاہِ صابر نے　　چھپایا پردۂ دل میں مگر نہاں نہ ہوا
جو واقعات ہمارے امامؑ پر گذرے　　کسی نبی کا بھی یوں سخت امتحاں نہ ہوا

نکل کے آگئے تیروں کی چھاؤں میں اصغرؑ　　ہزار حیف کہ یہ بے زباں جواں نہ ہوا
قریب وقت شہادت تھا دن بھی آخر تھا　　پدر سے ماتمِ فرزندِ نوجواں نہ ہوا
پڑی رہی یوں ہی بے دفن میتِ شبیرؑ　　سوائے رحمت ِ حق کوئی پاسباں نہ ہوا
برائے نام مسلمان جمع تھے لاکھوں　　پر ان میں ایک بھی بچے پہ مہرباں نہ ہوا
عطش کے حال کو قاتل سے کہہ گئے شبیرؑ　　یہ تشنگی تھی کہ خنجر تلک رواں نہ ہوا
وہ قصۂ غم حسرت جو شاہ پر گذرا　　سبھی تو کہتے ہیں پر آج تک بیاں نہ ہوا

سلام

شاعر اہلبیتؑ حضرت نجم آفندیؒ

ربط بڑھتا جارہا ہے ماتمِ شبیرؑ سے
استفادہ کر رہا ہوں موت کی تاخیر سے

واسطہ کیا ہو مجھے دنیا کی دارو گیر سے
ہاتھ خالی ہی کہاں ہیں ماتمِ شبیرؑ سے

حرّیت کی منزلوں میں سید سجادؑ نے
اک نیا جادہ بنایاپائے در زنجیر سے

سلسلہ جاری ہے صدیوں سے غمِ شبیرؑ کا
کتنے دل زخمی ہوئے ہیں حُر ملا کے تیر سے

جب زباں پر یاعلیؑ آتاہے فرطِ شوق میں
اک سہارا چاہتاہوں نعرۂ تکبیر سے

پوچھتے ہو اب غمِ شبیرؑ کی تاثیر کو
اب یہ آگے بڑھ چکا ہے منزلِ تاثیر سے

اہلِ بیتِ مصطفیؐ ہیں ماخذِ علم و عمل
کر تو دو ان کو الگ اسلام کی تصویر سے

کون سمجھے صاحبِ نہج البلاغہ کا مقام
مل گئی تحریر جب قرآن کی تحریر سے

ہم نے باب العلم کی چوکھٹ کا بوسہ لے لیا
لوگ ادھر الجھے رہے قرآن کی تفسیر سے

یہ اک ادنیٰ سی کرامت ہے غمِ شبیرؑ کی
آدمی انسان بنتا ہے غمِ شبیرؑ سے

ان سے کہدو جو خلافِ ماتمِ شبیرؑ ہیں
گردنیں اپنی بچاؤ دست خیبر گیر سے

تم نے قرآں دربغل جگ میں اندھیرا کر دیا
روشنی کی ہم نے اہلِ بیتؑ کی تفسیر سے

اپنے خوں سے نقش اِلّا اللہ کیوں لکھتے حسینؑ
کام چلتا گر دوات و خامہ کی تحریر سے

کربلا کی راہ میں حائل تھیں کتنی مشکلیں
نجم پہونچا لڑتا بھڑتا گردشِ تقدیر سے

کربلا کی راہ میں حائل تھیں کتنی مشکلیں
نجم پہنچا لڑتا بھڑتا گردشِ تقدیر سے

مرثیہ شامِ غریباں

شاعر اُمّی سید صادق علی ''چھنگا صاحب'' مرحوم حسینؔ جائسی

آج مقتل میں عجب بے سرو ساماں ہیں حرم　　دل ہیں مجروح کھلے سر ہیں پریشاں ہیں حرم
قتلِ شبیرؑ سے بیتاب ہیں گریاں ہیں حرم　　وارثوں میں نہیں اب کوئی تو حیراں ہیں حرم
ذکر مظلومیٔ شاہِ مدنی کرتے ہیں
کبھی آہیں تو کبھی سینہ زنی کرتے ہیں

خیمے سب جل چکے ہیں لوٹ چکے ہیں اعدا　　فرق پر ہے کسی بی بی کے نہ مقنع نہ ردا
شام ہونے کو ہے سنسان ہے جنگل سارا　　پاس بچوں کو لئے بیٹھی ہیں بنت زہراؑ
پیار کرتی ہیں اِسے گہہ اسے سمجھا تی ہیں
کوئی معصوم جو روتا ہے تو بہلاتی ہیں

رو کے فرماتی ہیں یہ خواہرِ سلطانِ انام　　اٹھو سجاد کہ اب دن ہوا جاتا ہے تمام
جھٹ پٹا وقت ہے کچھ دیر میں ہونے کو ہے شام　　اب نہ قاسمؑ ہیں نہ عباسؑ نہ اکبرؑ نہ امامؑ
دلِ پُر درد پہ اک غم کی گھٹا چھائی ہے
رات ہونے کو ہے اور عالمِ تنہائی ہے

کان میں پہونچی جو سجادؑ کے زینبؑ کی صدا　　کھول کر آنکھ یہ کی عرض بصد آہ و بکا
کیا کہوں آپ سے قابو میں نہیں دل بخدا　　تپ زیادہ ہے تو غفلت بھی ہے کچھ آج سوا
کون مارا گیا اور کون جدا ہوتا ہے
مجھ کو کچھ ہوش نہیں ہے کہ یہ کیا ہوتا ہے

بولے فضہ سے یہ پھر عابدِ بیمار و حزیں　　جتنے بچے ہیں بلالو تو انہیں میرے قریں
جمع فضہ نے کیا بچوں کو لالا کے وہیں　　پر نہ دو لڑکے تھے اور ایک سکینہؑ غمگیں
ڈھونڈنے چار طرف مثل نظر جاتی تھی
ان کے رونے کی صدا بھی نہ مگر آتی تھی

کہا عابد نے کہ اے خواہرِ سلطانِ ہدا　　لایئے شہ نے بنائی ہے جو فردِ شہدا
دیکھ لوں وہ تو مرے دل کو تسلی ہو ذرا　　نام تحریر ہے اس فرد میں کس کا کس کا
جو گئے خلد میں اب خواب ہے صورت ان کی
جو مرے ساتھ ہیں لازم ہے حفاظت ان کی

سن کے یہ کہنے لگیں زینبؑ تفتیدہ جگر　　لے گئے لوٹ کے اسباب تو سب بانیٔ شر
اسی اسباب میں وہ فرد بھی تھی اے دلبر　　سن کے کہنے لگے سجادؑ یہ بادیدۂ تر
فکر کچھ اور میں پابندِ الم کرلوں گا
قتل جو ہوگئے نام ان کے رقم کرلوں گا

کہہ کے یہ لکھنے لگے خاک پہ نامِ شہدا　　یاد آئے جو وہ سب کرنے لگے آہ و بکا
دل پہ اک تیر لگا نام جو اصغرؑ کا لکھا　　غمِ جانکاہ سے تھرا گئے سارے اعضا
یاد کرتے تھے انہیں جب تو جگر جلتا تھا
تین بچوں کا کہیں پر نہ پتہ چلتا تھا

رو کے کرنے لگیں سجادؑ سے زینبؑ یہ کلام　　جائے تشویش ہے دن کوئی گھڑی میں ہے تمام
ڈھونڈھنے بچوں کو جاتی ہوں کہ ہو جائے نہ شام　　دو اجازت مجھے بیٹا کہ تمہیں اب ہو امامؑ
راستہ بھول گئے ہیں نہ ادھر آئیں گے
دشت میں جاکے پکاروں گی تو مل جائیں گے

لے کے رخصت چلیں عابد سے وہ بنتِ زہراؑ آ ذرا ساتھ مرے مڑ کے یہ فضہ سے کہا
وہ بھی ہمراہ ہوئیں کرتی ہوئی آہ و بکا پاؤں رکھتی تھیں کہیں اور کہیں پڑتا تھا
جابجا دشت میں لاشے جو نظر آتے تھے
دل دھڑکتا تھا قدم خوف سے تھرّاتے تھے

آہ تھی لب پہ رواں اشک تھے اور دل تھا فگار اک طرف کو یہ چلی جاتی تھیں باحالتِ زار
ناگہاں دور سے دکھلائی دیا ایک سوار بولیں فضہ سے یہ زینبؑ کہ ذرا بڑھ کے پکار
منتیں اس کی کریں گے تو ترس کھائے گا
اس سے بچوں کا پتہ دشت میں مل جائے گا

حکم پانا تھا کہ فضہ نے یہ دی بڑھ کے صدا اے سوار اس طرف آ اس طرف آ بہرِ خدا
کوئی تکلیف نہ دیں گے تجھے ہم اس کے سوا ہم غریبوں کی ہے اک عرض اسے سنتا جا
دل ہے مجروح بہت روئی جو ہے بھائی کو
تجھ سے کچھ پوچھنا ہے فاطمہؑ کی جائی کو

متوجہ ہوا وہ سنتے ہی فضہ کی صدا پاس آ کر کہا کیا پوچھتی ہے اے دکھیا
بولیں یہ خواہرِ شبیرؑ کہ اے مردِ خدا کسی بچے کو تو دیکھا نہیں تونے یہ بتا
تشنہ لب ہیں، وطن آوارہ ہیں، دکھ پائے ہیں
چھوٹ کر ساتھ سے جنگل میں چلے آئے ہیں

عرض کی اس نے جگر تھام کے بادیدۂ تر ابھی صحرا میں جو اک سمت پڑی میری نظر
دیکھا اک لاشۂ پُرخوں ہے زمیں پر بے سر لڑکی اک چھوٹی سی بیٹھی ہوئی روتی ہے مگر
وہ بھی روتا ہے ادھر جس کا گذر ہوتا ہے
اس کے نالوں سے عجب دل پہ اثر ہوتا ہے

روکے فرمانے لگیں زینبؑ مجروح جگر   مہربانی کا صلہ دے تجھے ربِّ اکبر
بس پتہ مل گیا احساں ہوا تیرا مجھ پر   کہہ کے اس سمت چلیں گریہ کناں خاک بسر
اشک خوں بہتے تھے قابو میں دلِ زار نہ تھا
ایک فضہ کے سوا دوسرا غمخوار نہ تھا

پہونچیں القصہ وہاں پایا تھا جس جا کا پتا   دیکھا اس جا پہ ہے اک نور سے معمور گڑھا
لاش اک اس میں پڑی ہے کہ نہیں سر جس کا   اور سکینہؑ وہیں بیٹھی ہوئی کرتی ہے بکا
غش جو ہوتی ہے مزہ موت کا مل جاتا ہے
چونک پڑتی ہے تو دل سینے میں ہل جاتا ہے

آئیں نزدیک غرض زینبؑ تفتیدہ جگر   بیٹھ کر لے لیا آغوش میں بادیدۂ تر
بولیں لپٹا کے کلیجے سے میں قرباں تجھ پر   تو نے پہچان لیا باپ کا لاشہ کیوں کر
ہجر سے مادر ناشاد موئی جاتی ہے
بی بی اب گھر میں چلو رات ہوئی جاتی ہے

عرض کی اس نے پھوپھی سے یہ بصد آہ و بکا   فرقتِ شہ میں تڑپنے جو لگا دل میرا
آکے اس دشت میں چلائی میں بابا، بابا   اے پھوپھی مجھ کو اسی لاش سے آئی یہ صدا
آئی ہوں سینۂ شبیرؑ پہ سونے کے لئے
کہا زینبؑ نے کہ اب گھر چلو رونے کے لئے

یہ تو بہلاتی تھیں رو رو کے وہ دیتی تھی جواب   آتشِ غم سے وہ ننھا سا کلیجہ تھا کباب
گود میں مچلی ہوا دل جو زیادہ بیتاب   پیار کر کے اسے زینبؑ نے بچشمِ پُرآب
لی بلائیں کبھی، گہہ آنکھوں سے آنسو پونچھے
خونِ سرور سے بھرے جو تھے، وہ گیسو پونچھے

دونوں بچوں کو چلیں ڈھونڈھنے پھر وہ مضطر　ناگہاں جا پڑی اک سمت بیاباں میں نظر
دیکھتی کیا ہیں کہ وہ باغ نبی کے گل تر　باہیں گردن میں ہیں اور سو رہے ہیں رکھے سر
گرد اس طرح ہے ان چاند سے رخساروں پر
ابر باریک ہو جس طرح سے سیاروں پر

آئیں نزدیک جو روتی تو یہ نقشہ دیکھا　مٹی سرکا کے وہاں لیٹے ہیں وہ ماہ لقا
ہونٹ سوکھے ہوئے تھے پیاس جو تھی حد سے سوا　جس جگہ پا کے تری کچھ ہو کلیجہ ٹھنڈا
باپ کا سینہ نہیں ماں کی بھی آغوش نہیں
ایسے غافل ہیں کہ تن کا بھی انہیں ہوش نہیں

دیکھتے ہی انہیں بس بیٹھ گئیں زینبؑ زار　لے کے دونوں کی بلائیں کیا پھر خوب سا پیار
سر رکھے خاک سے زانو پہ اٹھا کر اک بار　بولیں اب گھر میں چلو نیند سے ہو کر ہشیار
سرد جنگل کی ہوا باعثِ آرام ہوئی
دشت غربت میں خبر بھی ہے تمہیں شام ہوئی

نیند سے جب ہوئے ہشیار نہ وہ رشکِ قمر　جھک کے پھر غور سے چہروں پہ کی زینبؑ نے نظر
دم نہ پایا تو یہ فرمانے لگیں پیٹ کے سر　شاید ان دونوں کا اب ہو گیا دنیا سے سفر
دشت ِ غربت میں کیا سب سے کنا را بچو
ہائے بے موت تمہیں پیاس نے مارا بچو

عرض کرنے لگیں زینبؑ سے یہ فضہ غمگیں　بی بی ہے ہے مرے دل کو یہی ہوتا ہے یقیں
لوٹ کر خیموں کو جانے لگی جب فوجِ لعیں　آ گئے گھوڑوں کی ٹاپوں میں یہ خورشید مبیں
حال ان کے جگر وقلب کو تڑپاتے ہیں
پھول سے جسموں پہ سب نیل نظر آتے ہیں

بس حسینؔ روک قلم اب نہیں تابِ تحریر　دل میں نشتر کی طرح چبھتے ہیں اب رنج کے تیر
صاف ہر زخم صدا دیتے ہیں ہے ہے شبیرؑ　کیسی برگشتہ ہوئی اہلِ حرم کی تقدیر
آسماں گر نہ پڑا چھٹ کے ستمگاروں پر
ظلم کیا کیا نہ کئے فاطمہؑ کے پیاروں پر